جلد ۱۱۰ اکتوبر ۱۹۸۸ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۱۰ | اکتوبر ۱۹۸۸ء مطابق صفر المظفر ۱۴۰۹ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رابطہ کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر ——— ۳۲۴۴۶۸

چندہ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سارے ہی عالمِ اسلام میں اسلام کے اُبھرنے میں نہایت موثر رکاوٹ یہ ہے کہ مخالفِ شریعت اقلیتیں، مغرب پرست غیر مسلم اقلیتیں، سوشلسٹ انقلاب پسند اور فرنگی استعمار کے پالے پوسے ہوئے لادینیت پسند اور مفاد پرست اور بندگانِ نفس قسم کے مسلمان یہ سب مل کر ہر جگہ خفیہ سازشوں سے، تخریبی کارروائیوں سے، اور لادینیت پرست ذرائعِ ابلاغ پر قابض ہونے کی وجہ سے پوری قوتِ تشہیر کے علاوہ حقائق کی مسخ کردہ تصاویر پیش کر کے مخالفِ شریعت بنکروں سے مسلمان اکابر اور مسلمان عوام پر حملے کر رہے ہیں اور مظاہروں کا سروسامان تیار بر تیار رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ کوتاہ بیں جدت مآب خواتین کی قوتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ اور پھر اس سارے معرکۂ انسدادِ شریعت کو اسرائیل، روس، امریکہ اور پوری یورپی برادری کی سرپرستی حاصل ہے ـــــ سب سے بڑھ کر پروپیگنڈا کی صورت میں، فنڈز کی فراہمی کی صورت میں اور جہاں ضرورت ہو، اسلحہ کی خفیہ فراہمی کی صورت میں۔

اتنا مشکل ہے۔ نفاذِ شریعت کا معرکہ ـــ کوئی سوئچ نہیں کہ آپ دبا دیں تو ہر طرف روشنی پھیل جائے گی۔

ایک مثال سوڈان میں ہمارے سامنے ہے۔ مہدی سوڈانی کے اس دیس میں تحریکِ اسلامی کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ اور یہ ساری تاریخ آج اس صورتِ حال میں سکڑ آئی ہے کہ نفاذِ شریعت کا مسئلہ سیاست کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد ہر شخص اور پارٹی کو مجبور کر چکا ہے کہ یا تو وہ اُس کا ساتھ دے، یا اس کی مخالفت کرے۔ اس ساری کشمکش میں اور جو کچھ ہو عوام کی اکثریت نفاذِ شریعت کے حق میں رہی۔ اِسی

کا نتیجہ تھا کہ صدر نمیری کو ستمبر ۱۹۸۳ء میں قانونِ شریعت کو سامنے لانا پڑا۔ پھر اپریل ۱۹۸۵ء میں اس کے دور کے خاتمے کے بعد ایک بار پھر مخالفین نے معرکہ کو تیز کر دیا جو اب تک جاری ہے۔

مشہور لیڈر حسن ترابی نے ۱۳ رجولائی کو مجوزہ قانونِ شریعت کو کابینہ کے سامنے رکھا۔ یہ قانون کے بعض ایسے حصوں کو تبدیل کر دیتا ہے جو شریعت کے مطابق نہ تھے اور آئندہ کے لیے اصل مسلّمہ احکام و حدودِ شریعت کو سامنے لاتا ہے۔ اِس مجموعۂ قوانین کو جلدی سے لشٹم پشٹم نہیں بنا دیا گیا بلکہ حکومت کی سابق رپورٹوں اور علماء اور مسلم قانون دانوں کی بین الاقوامی مجلس کے جائزوں، عبوری حکومت کے بنائے ہوئے مسودہ ہائے قانون، مصر، پاکستان اور عرب ممالک کے فوجداری قوانین اور الازہر کے اور عرب لیگ کے تیار کردہ خاکوں پر اچھی طرح غور کیا گیا ہے۔

اِس قانون میں شریعت کی ساتوں حدود شامل ہیں۔ یہ ایک اجمالی مسودہ ہے جو "ڈبل سپیس" ٹائپ کے ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں صرف ۸۸ دفعات ہیں جنہیں ۱۸ سیکشنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۳۱ میں فقہائے سلف کی مصطلحات کو شامل کیا گیا ہے۔

رائے عام کا سیاسی اندازہ کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جنوبی سوڈان میں ۱۰ فی صد عیسائی ہیں (کلیسا کے دعوے کے مطابق ۲۷ فی صد) ۱۰ فی صد مسلم ہیں اور ۸۰ فی صد توہم پرست۔

اِس پوری جنوبی آبادی کو حدود سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے دو مؤقر شاگردوں کے متفقہ مسلک کی روشنی میں جنوبی آبادی کے لیے تعزیر ہوگی۔[1]

---

[1] واضح رہے کہ مصر، سوڈان، نائیجیریا، تنزانیہ اور انڈونیشیا و ملائشیا میں ہر جگہ صلیبی مشنریوں نے اپنے اداروں اور لٹریچر کے جال پھیلا رکھے ہیں۔ اور قدیم اوہام پرست قبائل یا کلی طور پر جاہل قسم کے بعض مسلمانوں کو پھانس کر ہر اہم مسلمان ملک میں اپنے مضبوط اڈے بنا لیے ہیں۔ مشنری اداروں اور بیرونی عیسائی حکومتوں کی مدد سے عیسائی نسلوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کر کے حکومت اور فوج کے اونچے عہدوں تک پہنچا دیا ہے۔ اپنی بظاہر سوشل اور مذہبی مگر درحقیقت سیاسی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں، باہر سے اس مقصد کے لیے روپیہ چلا آرہا ہے کہ جس شخص کو چاہیں خرید لیں، اسلحہ کے ذخائر موجود ہیں، (باقی بر صفحہ آئندہ)

اب ذرا مخالفِ شریعت محاذ کا جائزہ لیجیے۔

— کمیونسٹ پارٹی۔

— بعث سوشلسٹ پارٹی۔

— لفٹسٹوں کی M L P S یعنی ساؤدرن لبریشن موومنٹ ۔(یعنی اس کا تو منشا ہی یہ ہے کہ جنوبی سوڈان کو الگ ریاست بنایا جائے) ۔ یہ جماعت مارکسی ایتھوپیا کی پشت پناہی سے پچھلے ۵ برس سے گوریلا جنگ لڑ رہی ہے ۔ صلح کی گفتگو کے لیے میز پر بیٹھنے کے لیے شرطِ اول یہ ہے کہ شریعت کو منسوخ کیا جائے۔

سوڈان کے متعلق لادینیت پسندوں، سوشلسٹوں، ناصریوں اور کمیونسٹوں نے دو تین ہفتے پہلے لندن میں ایک میٹنگ کی جس میں شریعت کی مخالفت کی گئی ۔ لفٹسٹوں کے زیرِ تسلط آئی ہوئی بار ایسوسی ایشن خرطوم نے اپنا پلیٹ فارم ہر اس شخص کے لیے کھول دیا ہے جو شریعت کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں۔

سوڈان کونسل آف چرچز (S.C.C.) نے شریعت لا کے سامنے آنے سے قبل ۱۵ جولائی کو اپنے ایک سیاسی بیان میں نئے قانونِ شریعت کو پیشگی مسترد کیا ہے ۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ شریعت غیر مسلموں کو ان کے اپنے کلچر اور عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے کے حق سے محروم کرتی ہے ۔ حالانکہ پورا جنوبی سوڈان قانونِ شریعت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور آن کو نیا قانون کسی بھی پبلک سرگرمی سے نہیں روکتا۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ بیرونی تنظیمیں اور مغرب کی پروپیگنڈا مشینری یہاں کے مخالفین سے کم تعصب زدہ نہیں ہیں ۔ اور تو اور، ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بڑی تیزی دکھا کر سوڈان کے حالات سے متعلق ایک رپورٹ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

مغربی ثقافت کے پھیلاؤ کے ذریعے مسلمانوں کو نا مسلم بنا کر اپنے سامنے لانے کا پروگرام جاری ہے ۔ جہاں کہیں یہودی، قادیانی یا مخالفِ اسلام فرقے یا لادینیت پسند اور مغرب پرست افراد مل جاتے ہیں، ان کو صلیبی سانپ فوراً نگل لیتا ہے ۔ یہی کچھ سوڈان میں بڑے زور شور سے ہوتا چلا آرہا ہے۔

لکھ ماری جس میں "شریعت" کو "ظالمانہ"، "غیر انسانی" اور "ذلیل کن" قرار دیا گیا ہے۔

قانونِ شریعت کی حامی قوتیں یہ ہیں:

— نیشنل اسلامک فرنٹ۔

— اُمّہ پارٹی۔

— ڈیموکریٹک یونینسٹ پارٹی۔

مجموعی طور پر ۲۶۵ نشستوں کے ایوان میں ان کو ۲۱۷ حاصل ہیں۔ چند افراد ایسے ہوں گے جو شاید ووٹ نہ دیں۔ پھر بھی تینوں جماعتوں کی اکثریت خاصی بھاری ہے۔

سب سے اہم یہ کہ ملک بھر کی مسلم اکثریت (۷۵ فی صد) کی عوامی پشت پناہی متذکرہ شریعت محاذ کو حاصل ہے۔

مگر مخالفِ شریعت عناصر کی اچھل کود اور شور شرابا خاصا پُر زور ہے، خصوصاً اس کے ساتھ بیرونی تنظیموں اور مغربی پروپیگنڈا کی طاقت شامل ہے اور بوقت ضرورت انہیں سیاسی معاونت بھی مل سکتی ہے، بلکہ وہ خانہ جنگی کا طوفان بھی اُٹھا سکتی ہیں۔

اِن حالات میں سوڈان کے علمبردارانِ شریعت کی خواہش یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے ہر گوشے سے ہمیں بھی پُر زور حمایت حاصل ہو، ہمارے ذرائع ابلاغ کام کر سکتے ہیں، جلسے ہو سکتے ہیں، ریزولیوشن بھیجے جا سکتے ہیں، مخالف تنظیموں کے سربراہوں کو خاص خطوط لکھے جا سکتے ہیں (جن کا شائع ہونا ایک مسئلہ ہے) سوڈان، مصر، سعودی عرب، لندن اور دوسرے مناسب مقامات پر کانفرنسیں منعقد کر کے اسلامی محاذ کو مضبوط کیا جا سکتا ہے۔"

مگر یہاں تو یہ حال کہ نہ کبھی کوئی مضمون چھپتا ہے، نہ کوئی بحث ہوتی ہے، یہاں تو اخبارات اچھی خاصی سپیس عورتوں کے بال بنانے کے طریقوں اور لباس کی نت نئی تراش خراش اور میک اَپ کے فن پر خرچ کر دیتے ہیں۔ دُنیا کے ہر گوشے کے مسلمان مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ان پر کوئی سلسلۂ مباحث نہیں چلتا، ان پر اداریے نہیں آتے، ان پر فورم نہیں بُلائے جاتے، ان پر نمبر نہیں نکالے جاتے۔

یہاں تو خود وہی صورتِ حالات درپیش ہے جو سوڈان میں ہے۔ حامیٔ شریعت اور مخالفِ شریعت محاذ بنے ہوئے ہیں، تیر اندازی ہو رہی ہے، ذرائع ابلاغ بھی زیادہ تر مخالف قوتوں کے قابو میں ہیں، یہاں بھی متعدد قوتیں ایسی موجود ہیں جو باہم مل کر مخالفِ شریعت کے اتحاد قائم کریں گی۔ تو لادینیت کے جھنڈے بلند ہوں گے اور پھر فضاؤں میں آواز گونجے گی کہ "پاکستان کا مطلب کیا، لا اِلٰہ اِلّا اللہ۔"

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں۔

(ادارہ)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

امیرِ جماعت، مجلسِ شوریٰ اور جملہ عہدہ دارانِ جماعت کی ذمہ داری

(ادارہ)

گذشتہ ۶ روز سے جماعت کے ۲ نہایت ذمہ دار عہدہ داران اس قسم کے بیان شائع کر رہے ہیں کہ قومی اتحاد کے انضمام کی صورت میں جماعتِ اسلامی اس میں مدغم ہونے کے لیے تیار ہے۔ یہ بات جماعت کے دستور کے خلاف ہے۔ ہمارے دستور میں امیرِ جماعت، مجلسِ شوریٰ اور تمام عہدہ دارانِ جماعت تحریکِ اسلامی کو چلانے کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں، نہ کہ اس کو ختم کرنے یا کسی جماعت میں ضم کرنے کے لیے۔ جماعت میں آخری فیصلہ کا اختیار ارکان کے اجتماعِ عام کو ہی حاصل ہے۔ اس کے فیصلے سے پہلے کوئی شخص بذاتِ خود ایسے اعلانات کرنے کا حق نہیں رکھتا جو جماعت کے مستقل وجود کو ختم کرنے کے ہم معنی ہوں۔"

(ہفت روزہ معیار، کراچی۔ مورخہ ۲۷ اگست تا ۳ ستمبر، ص ۷)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

شخصیت اور طریقِ کار کے چند گوشے

نعیم صدیقی

کسی اسلامی تحریک یا نظامِ جماعت کو چلانے کے لیے ذرا مختلف قسم کے اوصاف درکار ہیں۔ اس معاملے میں سرکارِ رسالت مآبؐ کی شخصیت مقدسہ اور ان کے مسلکِ پاکیزہ کا مطالعہ اولین ضرورت ہے۔ بعد ازاں حضورؐ کی پیروی میں حضورؐ کے پروگرام کے مطابق اقامتِ دین کا کام کرنے والوں کا جائزہ لینا مفید ہو سکتا ہے۔

اِس نقطۂ نظر سے میں جب مولانا مودودیؒ کے حُسنِ گفتار اور حُسنِ کردار کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنے نبی کی مشعل کو بلند کرنے اور اس کے گرد لوگوں کو جمع کرنے کے لیے خاص صلاحیتوں سے نوازا گیا تھا۔

میں یہاں صرف ایک چیز کو لیتا ہوں —— محبت و اعتماد!

وہ مرکز کے کارکنوں یا جماعتی رفیقوں یا آنے والے مہمانوں سے ہمیشہ محبت و اعتماد کا معاملہ کرتے تھے۔ یہ کسی کو کبھی محسوس نہ ہوا کہ مولینا اس پر کوئی شک رکھتے ہیں، اس کو ناپسند کرتے ہیں، کسی اور کو ترجیح دے کر اسے محسوس کراتے ہیں کہ ہمارے پاس تو تم سے بہتر لوگ موجود ہیں اور تم بھی اگر ان جیسا بننا چاہو تو ہماری پسند کی ترازو پر پورے اُترو۔ وہ ہر سوال یا اعتراض یا اختلاف پر تند و تیز بحث کر کے آدمی کو دبوچ نہیں لیتے تھے کہ اس کی جرأتِ اظہار ہی کچل جائے۔ وہ کبھی اتھارٹی اور اختیار نہیں جتاتے

تھے۔ وہ کسی سوال کا جواب یہ نہیں دیتے تھے کہ بس یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ نہیں، وہ بار بار مختلف لوگوں سے مختلف طرز پر استدلال کرتے رہتے ـــــ اہلِ علم سے، اہلِ اخلاص سے، اختلاف کرنے والوں سے، دفتر کے کارکنوں سے، معترضین سے۔ اس طرح وہ دلیل کی قوت سے آہستہ آہستہ میدان فتح کرتے چلے جاتے۔ بات کرنے والے کی بات کو کبھی کاٹ کر نہ رکھ دیتے۔ یہ نہ محسوس کراتے کہ یہ ہم آپ سے پہلے سے جانتے ہیں یا اس پر ہم پہلے بات کر چکے ہیں یا بیان دے چکے ہیں۔ کسی کو یہ بھی نہ کہتے کہ تم کسی سازش کا شکار ہو، تم پر کسی غلط قوت کا اثر ہے۔

بلکہ ان کا بنیادی طریق کار محبت سے زیادہ خیال کرنا ہوتا، پھر اگر کوئی شخص سابقی بنتا تو وہ اس پر پورا اعتماد کرتے اور اس کو ایسی ذمہ داری یا ایسا مقام تفویض کرتے کہ وہ ہکا بکا نہیں، بلکہ کانپتا رہ جاتا اور درخواست کرتا کہ مجھ سے بہتر آدمی مل سکتے ہیں۔ وہ فرماتے کہ آپ یہ کام کریں تو سہی، شاید آپ ہی موزوں آدمی ثابت ہوں۔ چنانچہ مولانا کا اعتماد میرے جیسے چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو بڑے بڑے کام کرنے کے قابل بنا دیتا۔

اُن کی بڑائی یہی تھی کہ جو ان کے قریب ہوا اُس کو اُنھوں نے احساس دلایا کہ تم ایک اہم آدمی ہو۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آہستہ آہستہ وہ آدمی بلند تر ہوتا چلا جاتا۔

مشاورتوں (اور مجالسِ شوریٰ) میں وہ نہ تو پہلے سے طے شدہ فیصلہ یا اسکیم یا منصوبہ لے کر آتے اور نہ بلا ارکان سے الگ پہلے کسی گروپ کو کسی خاص امر کے لیے تیار کرتے۔ بلکہ صورتِ حالات کا نقشہ سب سے سننے کے بعد کوئی ایک سوال سامنے رکھ دیتے، مثلاً انتخاب میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں، اور پہلے سے اپنی طرف سے کوئی رجحان سامنے لائے بغیر تمام رفقا کو آزادانہ اظہارِ خیال کا موقع دیتے۔ یہاں تک کہ بات ختم کر کسی ایک رُخ پر آجاتی۔ پھر وہ پھیلے ہوئے الفاظ اور خیالات کو سمیٹ کر سب سے یہ دریافت کرتے کہ کیا آپ کا نقطۂ نظر یہ اور یہ ہے؟ اگر محسوس ہوتا کہ فیصلے کا مرحلہ نہیں آیا، بلکہ اختلافی رجحانات موجود ہیں تو اجماع و اتفاق رائے پیدا کرنے کے لیے بحث کے خاص خاص پہلوؤں پر توجہ دلا دیتے کہ یہ اور یہ باتیں بھی زیرِ غور لا کر سوچیں۔ تا آنکہ دو تین دَور گفتگو کے چل کر کوئی ایسا فیصلہ طے پاتا جس پر پوری مجلس متفق الرائے ہو جاتی اور بالعموم کسی کے دل میں گھٹن نہ رہ جاتی کہ میری بات کو دبا یا گیا ہے۔ اگر کسی فرد کو ایسی شکایت ہوتی تو ایک آدمی کے لیے ساری بات کے اجزا پھر سامنے

لاتے - بہت ہی کم مواقع پر معمولی اقلیت کے استثنیٰ کے ساتھ اکثریتی فیصلے بھی کرنے پڑے، مگر ایسے انداز میں کہ اختلافی اقلیت کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ ہمارے خلاف کوئی خاص دباؤ ہے یا محاذ ہے، بلکہ غیر اختیاری طور پہ مجلس میں کامل اتفاق رائے پیدا نہیں ہو سکتا - ایسے حضرات اپنی آرا کو ایک طرف رکھ کر بخوشی اکثریتی فیصلے کی علمبرداری میں تعاون کرتے -

میرا خیال ہے کہ اسلامی نظامِ جماعت کی امارت اور اس کی تنظیم و تربیت کے بھاری کام کے لیے موجودہ دور کے لحاظ سے بہترین نمونہ سید مودودیؒ نے نہ صرف عملاً پیش کیا بلکہ تحریری طور پہ اپنے طریقِ کار کا ریکارڈ بھی چھوڑا اور عملی کردار کے گواہ بھی ابھی موجود ہیں -

مولانا کی صحتِ قیادت اور ان کی روشن محبت و اعتماد کا راز یہ تھا کہ وہ تحریک کے کام کو اصلاً اقامتِ دین کا کام اور اس کام کے ہر ضروری جز کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے سیاست کو کاملاً تابع دین رکھا - دین سے آزاد سیاست، دین سے آزاد جمہوریت یا دین سے آزاد انتخابات کا کوئی تصور دُور دُور تک ان کے ہاں نہ تھا - دین کی رہنمائی، مقاصد اور سرگرمیوں اور رابطوں میں بھی کارفرما رہتی - انہوں نے ووٹوں یا سیٹوں کی زیادہ تعداد حاصل کرنے کے لیے ایسے طریقے یا ایسے رابطے کبھی اختیار نہیں کیے جو دینی اُصولوں کے خلاف ہوں -

مولانا مودودیؒ کی ایک عظیم خوبی یہ تھی کہ وہ اُونچے سے اُونچے مرتبے پہ ہوتے ہوئے نچلی سے نچلی سطح کے کارکن تک برادرانہ یک جہتی کا گہرا رابطہ رکھتے - خط و کتابت کے ذریعے، گفتگوؤں کے ذریعے، اپنی شام کی مجلسِ عام کے ذریعے، دَوروں میں ایک ایک کارکُن سے ملاقات کے ذریعے وہ اپنے رابطے کو گہرا کرتے رہتے تھے - وہ کارکنوں کا ذہن جس طرح کئی سال میں تشکیل کرتے تھے، پھر اس بات کا لحاظ کرتے تھے کہ وہ کوئی ایسا فیصلہ و اقدام محض منصب، امارت یا مجلسِ شوریٰ کے اختیارات کی بنا پر نہ نافذ کر دیں جو خود ان کی بنائی ہوئی ذہنیت سے ٹکرائے اور ان کی اپنی ہی دی ہوئی تربیت کی فصل کو ویران کر دے - ان کی خاص صلاحیت تھی کہ وہ تحریک کے اُصول و مقاصد کو، جماعت کی روایات و اقدار کو، کارکنوں کے ذہن و مزاج کو پوری طرح نگاہ میں رکھتے تھے اور یہ اندازہ کر لیتے کہ کس معاملے میں کس وقت جماعت اور اس کے کارکنوں کے جذبات و احساسات کیا ہیں اور ان کی مانگ کیا ہے اور ان کی نفرت کا رُخ کدھر ہے اور ان کی محبت کی سمت کدھر ہے، کس بات پر وہ جمع ہوں گے، کونسی چیز ان کو

بحثا بحثی میں ڈال دے گی یا بکھیر دے گی۔ نتیجہ یہ کہ وہ کسی مسئلہ خاص کو بھی اصولِ دین اور مصالحِ شرعیہ کے تحت خوب جانچتے اور پھر کارکنوں کے ذہن کی تحریکی ساخت کا بھی صحیح ناپ تول کرتے۔ پھر جب وہ کوئی بات کہتے تو لوگوں کے چہرے روشن ہو جاتے اور دل کھل اٹھتے اور ان میں کام کرنے اور آگے بڑھنے اور قربانیاں دینے کی اسپرٹ جاگ جاتی۔ سب کے دل جمع ہو جاتے۔ بہت ہی کم کبھی ایسا ہوا کہ کچھ جزئی امور پر کارکنوں کا فوری طور پر پورا پورا اطمینان نہیں ہوا، لیکن پھر بھی وہ تھوڑی سی بہت افہام و تفہیم ہو جانے پر جادۂ فرض پر خوش خوش متحرک ہو گئے۔ یعنی اوپر سے نیچے تک رشتۂ اعتماد بحال رہا۔ اندریں صورت تمام کارکن یہ سمجھتے تھے کہ مولانا مودودی خود کوئی بیان دیں، فیصلہ ہو یا مجلسِ شوریٰ میں کوئی بات طے ہو، ہم سب کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور ہمیں اہمیت دی جاتی ہے۔ کم سے کم یہ تو بالکل طور طریق نہ تھا کہ کارکنوں کی تحقیر کر کے انہیں کوئی ادنیٰ درجے کی چیز قرار دیا جائے یا یہ ظاہر کیا جائے کہ کارکنوں کا ذہن یا نقطۂ نظر کچھ بھی ہوا کرے، فیصلہ کرنے والے تو ہم ہیں جس پر انہیں لازماً عمل کرنا ہوگا سوچنے اور بات کہنے کا یہ انداز ہی خطرناک ہے۔ یہ ہماری خاص طرز کی تنظیم کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ ہم تو اپنے ہر کمزور ساتھی کو بھی احساس دلانا چاہتے ہیں کہ تم بہت اہم ہو اور ہم تمہیں ساتھ لے کے چلیں گے اور تم جو جذبات و احساسات رکھتے ہو اور جو کچھ تم نے لٹریچر اور تنظیم سے حاصل کر کے اپنا ذہن بنایا ہے، اس کا ہم پورا لحاظ رکھیں گے۔ تم اس مشینری کا لازمی حصہ ہو۔ تم سوال بھی کرو، مشورے بھی دو، اعتراض بھی اٹھاؤ، پریشانی بھی ظاہر کرو، ہمیں تمہارے اس تعاون کی ضرورت ہے۔ یہ طرزِ عمل تھا جو مولانا مودودیؒ نے اختیار کیا اور میں یا کوئی اور جس نے ان کے ساتھ کام کیا ہے، وہ اس کے گواہ ہیں۔

ایسی بہت سی باتیں ہیں مولانا مودودیؒ کے متعلق جاننے کی، اور پوچھنے اور بتانے کی! افسوس کہ میرے قویٰ بھی محدود ہیں، وقت بھی محدود ہے اور ترجمان کے صفحات بھی محدود ہیں۔

تاہم جو کچھ میں نے گذارشات کی ہیں، ان پر اگر اخلاص کے ساتھ غور کیا جائے تو میرا ہر رفیق روشنی حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری طرف ناراض ہونے والے مہربان زجر و توبیخ بھی کر سکتے ہیں۔

"مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر"

(ترجمہ: میں تو ایک مسکین سا دل ہوں جو موجودہ کشمکش میں گھِر گیا ہے!)

کیا کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا؟

جناب محمد رفیق چوہدری

دورِ جدید کے بعض تجدد پسند حضرات نے نبی اور رسول کے درمیان فرق و امتیاز کی بحث کرتے ہوئے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ اللہ کے نبیوں کو اُن کی قوم بعض اوقات قتل بھی کر دیتی رہی ہے، مگر کسی قوم کے ہاتھوں کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا۔ یہ لوگ اس امر کو ایک اُصول بلکہ قانونِ الٰہی قرار دیتے ہیں کہ نبی کے لیے وفات پانے یا قتل ہونے کی دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اللہ کا رسول وفات پاتا ہے، کبھی قتل نہیں ہوتا۔

چنانچہ بعض لوگوں کے امام صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"رسولوں کا کسی قوم کے ہاتھوں قتل ہونا ثابت نہیں ہے۔"

(تدبرِ قرآن، جلد ۷، ص ۵۴۲ - سورہ قٓ کی آیت ۱۴ کے تحت)

انہی امام صاحب کے ایک مقتدا اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

"رسولوں کے بارے میں اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کی کامل حجت بن کر آتے ہیں۔ وہ آفتابِ نیم روز کی طرح قوم کے آسمان پر چمکتے ہیں۔ کوئی دانا و بینا کسی دلیل و برہان کی بنا پر اُن کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو کسی حال میں ان کی تکذیب کرنے والوں کے حوالے نہیں کرتا۔ نبیوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی قوم ان کی تکذیب ہی نہیں کرتی، بارہا ان کے قتل کے درپے ہو جاتی ہے۔ اور ایسا ہوا بھی ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ تورات کا اپنا بیان ہے کہ نہ کریا کو عین ہیکل سلیمانی میں مقدس

اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔ یرمیاہ نبی رسّی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیئے گئے۔ حضرت یحییٰؑ کا سر قلم کر کے ہیرودیس نے اپنی محبوبہ کی نذر کر دیا۔ قرآنِ مجید نے بھی یہود کی فردِ قراردادِ جرم میں نبیوں پر اس تعدّی کا ذکر اکثر مقامات پر کیا ہے۔ لیکن قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے معاملے میں اللہ کا قانون اس سے مختلف ہے۔"

(ملاحظہ ہو ماہنامہ اشراق، ماہ اگست ۱۹۸۹ء، مضمون نبوّت و رسالت)

اس کے بعد امام صاحب کے پیروکار رسولوں کے معاملے میں اللہ کے اس مختلف قانون کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام[1] اور پھر آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالیں دے کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کے برعکس رسولوں کے لیے خاص حفاظت کا اہتمام کرتا ہے۔ نہ اُن کو اُن کی قوم کے حوالے کرتا ہے، اور نہ قوم ان کو کسی حال میں قتل کر سکتی ہے۔

مگر ان متجددین کی یہ نکتہ طرازی خود قرآن کے نصوص ہی کے خلاف ہے، جس کی تفسیر و تشریح میں انہوں نے نبی اور رسول کے درمیان یہ نیا اور نرالا فرق پیدا کر دیا ہے۔

قرآن کے نصوص | قرآن مجید کے جن شواہد اور نصوص کی بنا پر ہم نبی اور رسول کے اس فرق و امتیاز کو غلط قرار دیتے ہیں۔ اُن کی تفصیل یہ ہے:

ا۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دوسرے رسولوں کی طرح ایک رسول ہونے کی حیثیت سے وفات پاتے یا قتل ہونے کی دونوں صورتوں کا امکان موجود ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ

[1] واضح رہے کہ اس ضمن میں عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے صاحبِ مضمون نے اُن کی وفات بھی ثابت کر دی ہے۔

فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط - (آلِ عمران ۱۴۴)

"اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بس ایک رسول ہی ہیں۔ اُن سے پہلے اور بھی رسول گذر چکے ہیں۔ پس اگر یہ وفات پاجائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں واپس چلے جاؤ گے اور جو کوئی بھی اُلٹے پاؤں واپس چلا جائے گا۔ وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا۔"

مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی رسول ہیں جس طرح اُن سے پہلے دوسرے رسول بھیجے گئے تھے۔ اور وہ بھی پہلے رسولوں کی طرح وفات پاسکتے ہیں یا قتل ہوسکتے ہیں تو کیا اہلِ ایمان کے لیے کسی صورت میں بھی یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ ایمان کی راہ کو چھوڑ کر کفر کی راہ پر چل پڑیں؟ اگر ایسا کریں گے تو اللہ کا نہیں اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے۔

۲۔ سورہ بقرہ کی آیت ۸۷ میں ہے کہ:

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝

" تو کیا جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس وہ چیز لے کر آیا جو تمہارے نفس کو پسند نہ آئی تو تم نے تکبر کی راہ اختیار کی۔ پھر بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو تم قتل ہی کرتے تھے۔"

مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے پاس جو رسول بھی آیا تو اُسے اُن کے استکبار کا سامنا کرنا پڑا۔ احکام الٰہی پر عمل کرنا اُن کو گوارا نہ ہوا۔ پھر کسی رسول کی تو صرف تکذیب ہی کی مگر کسی کو قتل ہی کر ڈالا۔

۳۔ پھر سورہ مائدہ آیت ۷۰ میں ہے کہ:

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝

"بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کے پاس کئی رسول بھیجے۔ جب کبھی کوئی رسول اُن کے پاس وہ چیز لائے جو اُن کو پسند نہ آئی تو بعض کو وہ جھٹلاتے تھے اور بعض کو قتل ہی کر ڈالتے تھے۔"

گویا بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے میثاق لیا تھا۔ اُن کی طرف اپنے بہت سے رسول بھیجے تھے۔ مگر بنی اسرائیل کا رویہ کیا رہا؟ وہ ہر ایسے رسول کی، جو اُن کی نفسانی خواہشات کے خلاف احکام الٰہی لاتا، تکذیب کر دیتے اور کبھی اُسے قتل بھی کر دیتے تھے۔

۴۔ اسی طرح سورہ آل عمران آیت ۱۸۳ میں بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا گیا کہ:

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی نیاز نہ پیش کرے جسے آگ کھا جائے۔ آپ کہہ دیجیے کہ مجھ سے پہلے یقیناً تمہارے پاس رسول آئے دلائل لے کر اور اس چیز کے ساتھ جسے تم کہہ رہے ہو۔ پھر تم نے ان کو قتل کیوں کیا، اگر تم سچے ہو"۔

بنی اسرائیل کے بارے میں بتایا گیا کہ اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ کسی ایسے رسول پر کبھی ایمان نہ لائیں جو ان کے سامنے نیاز یا قربانی کو آسمانی آگ سے نہ جلا دے۔ اس دعوے کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ اے نبیؐ! آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر یہی بات ہے تو جو رسول ان کے پاس دلائل اور مذکورہ معجزہ بھی لاتے رہے اُن کی انہوں نے کیوں تکذیب کی تھی اور ان میں سے بعض کو کیوں قتل کر ڈالا تھا؟

قرآن مجید کے یہ دلائل و براہین اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ اللہ کے نبیوں کی طرح رسول بھی بعض اوقات اپنی قوم کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔ بالخصوص بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد ہوا کہ انہوں نے بہت سے رسولوں کی نہ صرف تکذیب کی، بلکہ ان کو قتل بھی کر ڈالا تھا۔ لہٰذا یہ دعویٰ کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ قانونِ الٰہی یہی رہا ہے کہ کبھی کوئی رسول کسی قوم کے ہاتھوں قتل نہیں ہوا؟

متجددین کا فکری تضاد

متجددین حضرات کے ہاں فکری تضاد کی بہتات ہے۔ ایک جگہ جس امر کا اثبات کریں گے دوسری جگہ اُسی کی نفی کر دیں گے۔ حدِ رجم کا معاملہ ہو یا اجماعِ اُمت کے حجت ہونے پر صحیح احادیث کے واجب العمل ہونے کی بات ہو یا خبرِ واحد کی حجیت کا۔ ہر جگہ ان کا تضادِ فکری

نمایاں ہو کر سامنے آئے گا۔ یہی صورتِ حال قتلِ رسول کے ممکن ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں ہے۔ اس مسئلے میں بھی انہوں نے اپنے تضادات کا کمال دکھایا ہے۔

صاحبِ تدبر قرآن نے سورۂ ق آیت نمبر ۱۴ کے تحت یہ لکھا ہے کہ:

"رسولوں کا کسی قوم کے ہاتھوں قتل ہونا ثابت نہیں ہے۔"

(تدبر قرآن، جلد ۷، ص ۵۴۲)

مگر اسی تفسیر میں بعض مقامات پر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ رسول بھی قتل ہو سکتا ہے اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں بہت سے رسول قتل ہوئے ہیں۔ مثال کے طور:

۱۔ آلِ عمران کی آیت ۱۴۴ کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب تدبر قرآن یہ تحریر کرتے ہیں کہ:

"مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں بہت سے رسول گزرے ہیں، اسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اللہ کے رسول ہیں۔ جس طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں دوسرے رسولوں کو پیش آئیں۔ اسی طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں انہیں بھی پیش آسکتی ہیں جس طرح تمام رسولوں کو موت کے مرحلے سے گزرنا پڑا، انہیں بھی ایک دن وفات پانا ہے۔ ان کے رسول ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ وفات نہیں پائیں گے یا قتل نہیں ہو سکتے یا کسی مصیبت یا ہزیمت کا ابتلاء انہیں پیش نہیں آسکتا۔ اگر کسی نے اس غلط فہمی کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا اور اب احد کے حادثے کے بعد کسی تذبذب میں مبتلا ہو گیا ہے اور وہ از سر نو جاہلیت کی زندگی کی طرف پلٹ جانا چاہتا ہے تو پلٹ جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا بلکہ اپنی ہی دنیا اور آخرت برباد کرے گا۔"

(تدبر قرآن، جلد ۲، ص ۱۸۵ تا ۱۸۶)

۲۔ پھر سورۂ آلِ عمران آیت ۱۸۳ کے تحت اسی تفسیر میں بنی اسرائیل کے بارے میں لکھا گیا ہے

"ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے ایسے رسول آچکے ہیں، جو نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے اور وہ معجزہ بھی انہوں نے دکھایا، جس کا تم نے ذکر کیا تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا؛ تمہارا یہ فعل تو اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ تم اپنی اس بات میں بھی جھوٹے ہو۔ اگر تم کو یہ معجزہ بھی دکھا دیا جائے گا جب بھی تم اپنی ضد پر اڑے رہو گے اور ایمان نہ لانے کا

کوئی اور بہانہ تلاش کر لو گے۔"

(تدبر قرآن - جلد ۲، ص ۲۲۰ تا ۲۲۱)

۳ - پھر اسی تفسیر میں سورۂ مائدہ آیت ۷۰ کی تفسیر کرتے ہوئے بنی اسرائیل سے متعلق لکھتے ہیں:

" فرمایا کہ ان سے جس کتاب و شریعت کی پابندی کا عہد لیا گیا تھا اور جس کی تجدید اور یاددہانی کے لیے اللہ نے یکے بعد دیگرے اپنے بہت سے رسول اور نبی بھی بھیجے، اس عہد کو انہوں نے توڑ دیا اور جو رسول اس کی تجدید اور یاددہانی کے لیے آئے، ان کی باتوں کو اپنی خواہشات کے خلاف پاکر یا تو ان کی تکذیب کر دی یا ان کو قتل کر دیا۔"

(تدبر قرآن - جلد ۲ - ص ۵۶۶)

اس طرح ہمارے زمانے کے متجددین ایک ہی سانس میں رسول کے قتل ہونے کو ممکن بھی قرار دیتے ہیں۔ اور ناممکن بھی۔ جیسے حدِ رجم کو جُرم زنا کی سزا مانتے بھی ہیں اور نہیں بھی مانتے، کہیں عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت کرتے ہیں اور کہیں صرف رفعِ عیسیٰ مانتے ہیں۔

صاحبِ تدبر قرآن نے اپنی تفسیر میں تضادِ فکری کے ایسے بہت سے شاہکار پیش کئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کے باوصف دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس پر تدبر کرنے کے جو اصول انہوں نے پیش نظر رکھے ہیں اور جو معیارِ تفسیر انہوں نے قائم کیا ہے وہ چودہ سو برس سے کسی مفسرِ قرآن کو نصیب نہیں۔

مفکرین پیدا کیجیے

(تنظیمِ اساتذہ کے ایک اجتماع سے خطاب)

جناب پروفیسر سید محمد سلیم (تنظیم اساتذہ پاکستان)

ایک طرف تو دینی تعلیم اور وعظ و نصیحت کا سلسلہ ہے۔ یہ مسلسل جاری ہے۔ گھر پر والدین اولاد کو دینی احکام پر عمل پیرا ہونے کی نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ درس گاہوں میں اساتذہ نیکی اور بھلائی کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ مسجدوں میں، خطبات میں اور درسوں میں یہی نصیحت ملتی رہتی ہے۔ اخبارات اور رسائل میں مختلف تقریبات کی مناسبت سے مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا ماحصل بھی یہی ہوتا ہے کہ دینی احکام کا اتباع کیا جائے۔ ریڈیو اور ٹی وی سے درسِ قرآن اور دینی مذاکرات نشر ہوتے رہتے ہیں جن کا ماحصل بھی دینی احکام کی پیروی پر اُبھارنا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ اور سالوں سے ہوتا آیا ہے۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اتنی ساری پیہم کوششوں کے نتیجے میں اتباع اور پیروی عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتی۔ انگریزی تہذیب کے غلبہ کے بعد سے دینی احکام کی پابندی زد میں ہے۔ بے عملی اور بے دینی کی رَو روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

دوسری جانب مغربی تہذیب کی یلغار ہے جو انگریز کے چلے جانے کے بعد بھی روز افزوں بڑھ رہی ہے۔ آزادی کے بعد سے اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ انگریز نے ایک دن بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ تم انگریزی لباس پہنو، انگریزی بال رکھو، انگریزی رہائش اختیار کرو، خواتین سے یہ نہیں کہا کہ تم بے پردہ ہو جاؤ، اپنے جسم کے حصوں کی نمائش کرتی پھرو، بال کٹاؤ۔ کسی دن براہِ راست انگریز نے اپنے افکار کی تبلیغ و اشاعت نہیں کی۔ مگر انگریز کی نقالی کی رفتار میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ آزادی کے بعد

تو گھریلو زبان میں انگریزی الفاظ گھس آئے ہیں۔ مثلاً انکل، آنٹی، لٹریچر وغیرہ جیسے الفاظ اب روزمرہ بن گئے ہیں۔ گلی کے نکڑ پر چوڑیاں بیچنے والا شخص بھی اپنی دوکان پر "بینگل شاپ" کا بورڈ آویزاں کرتا ہے۔ درآنحالیکہ وہ خود ناخواندہ ہے، جو خواتین یہاں آتی ہیں وہ سب ناخواندہ ہوتی ہیں۔ پھر بھی بورڈ انگریزی میں ہیں۔

یہاں بجا طور پر ایک سوال ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ ایک جانب باوجود کوشش کے عمل ندارد یا بہت کم ہے۔ دوسری جانب بغیر کوشش کے عمل کی رفتار بہت تیز ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ اس کی کیا وجوہات ہیں؟ صدیوں سے مسلمان علماء اور واعظین کہتے چلے آرہے ہیں کہ مسلمانوں کا زوال اسلامی احکام پر عمل درآمد نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ بلاشبہ مرض کی یہ تشخیص درست ہے، مگر کافی نہیں ہے۔ مزید یہ بیان کرنے کی ضرورت تھی کہ اسلامی احکام پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا؟ اس میں عدم توجہی کیوں ہے؟ اگر آغاز ہی میں یہ تشخیص کر لی جاتی۔ صحیح مرض اور خرابی کی نشاندہی کر دی جاتی تو پھر بہت پہلے علاج شروع ہو جاتا اور بہت پہلے زوال کی رو کو مؤثر انداز میں روکا جا سکتا تھا۔ بہت پہلے اسلامی پیش قدمی کا آغاز ہو چکا ہوتا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی فرد ہو وہ منفرد زندگی نہیں گزارتا۔ بے تعلق اور سب سے کٹ کر زندگی بسر نہیں کرتا۔ وہ ہر حال میں ایک گھرانے، کنبے اور برادری کا جزو ہوتا ہے۔ اس کی سوچ کنبے، برادری اور معاشرے سے باہر نہیں جاتی۔ قیدِ تنہائی میں بند قیدی بھی اپنے گھر، کنبے اور برادری سے متعلق افکار و خیالات میں غلطاں اور پیچاں رہتا ہے۔

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جب انسان کی سوچ منفرد نہیں ہے تو اس کا عمل منفرد، کٹا ہوا اور غیر مربوط کیسے ہو سکتا ہے۔ معاشرہ میں شامل ہر فرد معاشرہ میں رائج اور مقبول افکار و اقدار کے زیرِ اثر رہتا ہے۔ ہر فرد معاشرہ میں مقبول معیارِ افکار و اعمال سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے کی شعوری اور لاشعوری کوشش میں مشغول رہتا ہے۔ جو افکار و اقدار معاشرہ میں غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کو ایک ایک فرد اختیار کر لیتا ہے اور جو افکار و اقدار معاشرہ میں غلبہ حاصل نہیں کر پاتے یا شکست کھا جاتے ہیں ان کی قدر افرادِ معاشرہ کی نگاہ میں گر جاتی ہے۔

لوگ ان کو ترک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ بے پردگی ذلت کی علامت شمار ہوتی تھی۔ جس کو ایک عورت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ جہانگیر بادشاہ کی بیگم نور جہاں اپنے محل کی چھت پر کھڑی تھی۔ قریب سے ایک دیہاتی گزر رہا تھا، اس نے بیگم کو دیکھ لیا۔ بیگم کو اپنی بے پردگی کا احساس اس قدر شدید ہوا کہ اس نے شدتِ جذبات میں اس دیہاتی پر طپنچہ داغ دیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ معاشرتی اقدار آج کے دور میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ آج کی نور جہاں حسنِ صورت اور حسنِ صوت کا مظاہرہ کرتی پھرتی ہے۔ اور اس پر وہ خوش ہے۔ آج معیارِ مقبول تبدیل ہو گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ معاشرہ میں شامل فرد معاشرہ میں رائج اور مقبول افکار و اقدار سے متاثر ہوتا ہے۔ ان سے مربوط رہتا ہے۔

جس دور میں اسلامی تہذیب کا اور اسلامی اقدار کا ہمارے معاشرہ میں غلبہ تھا۔ کوئی اس کا مقابل اور مزاحم نہیں تھا، اس دور میں صرف اسلامی احکام کا پیش کر دینا کافی تھا۔ تب علماء کا وعظ و نصیحت کر دینا بالکل کافی تھا۔ لیکن آج ہمارے معاشرہ پر مغربی تہذیب اور مغربی افکار کا غلبہ ہے۔ ہر سال جدید درس گاہوں سے لاکھوں لڑکے اور لڑکیاں مغربی اقدارِ حیات کا درس لے کر معاشرہ میں داخل ہوتی رہتی ہیں۔ مغربی افکار و اقدار کو پھیلاتی رہتی ہیں اور قدیم اسلامی رنگ کو پھیکا بناتی رہتی ہیں۔ اِن حالات میں نصیحت کرنے والوں کی تعداد خواہ کتنی ہی کثیر ہو، صرف یہ کہتے رہنا کافی نہیں ہے کہ اسلامی احکام پر عمل کرو۔

بدقسمتی سے گذشتہ ڈیڑھ صدی سے یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اسلامی احکام کے پسِ پردہ اسلامی اقدار کی بات کی جاتی۔ اسلامی احکام کی غایات بیان کی جاتیں۔ مغربی اقدار سے ان کا تقابلی موازنہ کیا جاتا۔ دلائل اور براہین سے مغربی اقدار پر ان کی برتری واضح کی جاتی۔ نوجوان مغربی تعلیم یافتہ نسل کو عقلی طور پر مطمئن کیا جاتا۔ ان کے شکوک و شبہات رفع کیے جاتے۔ اگر یہ سب کچھ کیا جاتا تو نئی نسل ضرور بالضرور ایسے علماء کے گرد جمع ہو جاتی اور ان کے ارشادات کی پیروی کرتی۔

علامہ اقبال نے سب سے پہلے ہمارے ملک میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ انھوں نے مغربی تہذیب پر تنقید کی اور اسلامی اقدار کی تائید کی۔ عقل و خرد سے بات کی۔ ان کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ ان

کے اقوال کو سند کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہی طریقہ اختیار کیا علمی میدان میں انہوں نے مغربی افکار و اقدار کو چیلنج کیا۔ غیر مرعوبانہ انداز میں بات کی۔ عقلی اور فکری انداز میں اسلامی احکام کی حکمتیں بیان کیں۔ ان کی برتری واضح کی۔ عقل کی ہدایت پر وحی کی ہدایت کی برتری واضح کی۔ ایک خلق نے ان کے افکار کو سنا اور پڑھا۔ اور پھر ان کے گرد جمع ہو گئی۔ ان کی کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہوئے۔ وہاں کے لوگ بھی ان افکار و خیالات سے متاثر ہوئے۔

یہ دور عقلی انداز میں بات کرنے کا ہے۔ اسلامی احکام کی حکمتیں بیان کرنے کا ہے، دلیل اور برہان سے بات کرنے کا ہے۔ تقابلی انداز میں بات کرنے کا ہے۔ مغربی درس گاہوں سے کھیپ در کھیپ نکلنے والے طلبہ یہ کام نہیں کر سکتے۔ مغرب کے زرے مقلد یہ کام نہیں کر سکتے۔ اسلام کے مومن اور مغرب کے نقاد مسلمان یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ غور و خوض کرنے والے مسلمان یہ کام کر سکتے ہیں۔ دلائل اور براہین تلاش کرنے والے یہ کام کر سکتے ہیں۔ ایمانِ راسخ اور فکرِ صالح رکھنے والے یہ کام کر سکتے ہیں۔

پس اے معزز گروہِ اساتذہ! مخلص مومن اور دقیقہ رس حقیقت بیں طلبہ پیدا کیجیے۔ رَو میں بہنے والے نقالوں سے کام نہیں چلے گا۔ طبع زاد مفکرین کی ضرورت ہے۔ اس لیے غلبۂ اسلام کی تڑپ طلبہ کے دلوں میں پیدا کیجیے۔ پھر دماغوں میں فکرِ اسلامی کے سوتے پھوٹیں گے۔ ان کی آبیاری کیجیے۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھیے اور اپنا فریضہ انجام دیجیے۔

خصوصی مطالعہ

پھر مارشل لا آگیا

محترم پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب کی یہ کتاب (۲۳۶ صفحات) جنگ پبلیکیشنز نے کمپیوٹرائزڈ طباعت سے شائع کی ہے۔

سیاسی اکابر نے مارشل لا اور غیر پارلیمانی زندگی کی فرصتوں کو کتاب نویسی میں صرف کیا۔ اور اسٹیج کی دنیا سے وہ کاغذ کی دنیا میں آ گئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہر شخص کے نقطۂ نظر سے تاریخ کے کچھ پہلوؤں کی تصاویر تازہ ہو گئیں اور یہ سرمایۂ نگارش آئندہ کے مؤرخین کو بہت کام دے گا۔ ویسے سیاسی آدمی مستقبلِ بعید کے مؤرخ سے زیادہ مستقبل قریب کے سیاسی مفاد سے دلچسپی رکھتا ہے اور اسے کچھ حسابات چکانے ہوتے ہیں اور کچھ ناوک افگنیاں بھی۔ اس طرح "یوسفِ بے کارواں" والی کیفیت اور "یاد ایام" والی حالت دونوں سے فرار والی راہ بھی نکل آتی ہے۔ اب مثلاً ہمارے برادرِ معظم پروفیسر غفور صاحب اس دور کو کس طرح فراموش کر سکتے ہیں جب کہ وہ قومی اتحاد کے عہدہ دار کے طور پر وقت کے آمر اور اس کی حکومت کے ساتھ سمجھوتوں کی گفتگوؤں میں ایک لمبا عرصہ مصروف رہے۔ بعد میں نہ ان راتوں کا لوٹنا ممکن تھا، نہ ان دنوں کا، لیکن یہ رستہ ضرور رہا کہ وہ سمجھوتے کی ابتداء سے لے کر لبِ بام ناکامی تک کی تاریخ بیان کر سکیں۔ یہ تاریخ آئندہ کے سیاسی لیڈروں کو بھی اور مؤرخوں کو بھی کام دے گی۔ اس لحاظ سے ان کی سعی قابلِ داد ہے۔ واقعات کی ترتیب اور تفصیلی یادداشتوں اور ضروری مسودوں کا یکجا کر دینا کوئی معمولی کام نہیں۔

مصالحتی راستہ بنانے کی کوشش کی کڑیاں یہ سامنے آتی ہیں:

— ۱۳ مارچ۔ بھٹو کی طرف سے بات چیت کی دعوت مفتی صاحب کو۔ (ص ۱۱۷)

—— اپریل میں اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے ایک فارمولا پیش کیا۔ (ص ۔ ۱۵۰)

—— ۳/مئی ۔ قومی اتحاد کی تجاویز کا خاکہ حکومت تک پہنچایا گیا۔ (ص ۔ ۱۶۷)

—— ۴/مئی ۔ اصغر خاں کا پیغام فوج کی ہائی کمان کو کہ وہ ایک فرد (بھٹو) کی غیر آئینی کارروائیوں کا ساتھ نہ دیں۔ (ص ۔ ۱۶۷)

—— ۶/مئی ۔ قومی اتحاد کا خاکہ تجاویز پریس میں دے دیا گیا۔ (ص ۔ ۱۶۷)

—— ۲۳/جون ۔ مفتی صاحب کا بھٹو سے استعفیٰ کا مطالبہ (ص ۔ ۲۲۲)

—— ۲۸/جون ۔ بھٹو صاحب نے قومی اتحاد کے نئے خاکے پر بات چیت کرنے کی آمادگی ظاہر کر دی۔ (ص ۲۲۶)

—— ۳۰/جون ۔ معاہدہ کی ۳۰ شقوں میں سے پیرزادہ نے ۱۷ پر اپنی رضامندی دے دی۔ (ص ۔ ۲۲۹)

—— مسودہ اور ترمیمی اور قومی اتحاد کی آپس میں سخت بحث (ص ۲۱۲ ..... ص ۲۴۱)[1]

—— آخری گفتگو ۔ ۲/جولائی ۔ میاں طفیل محمد: معاملہ لبِ بام آ پہنچا ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے خراب نہ کریں۔ (ص ۔ ۲۴۳)

—— ۲/جولائی ۔ بیگم نسیم ولی خاں ۔ من جانب ولی خاں بھی ۔ اصغر صاحب بھی یہ چاہتے تھے کہ معاہدہ نہ کریں، مارشل لا لگنے دیں ۔ مفتی صاحب کا انکار۔ (ص ۔ ۲۴۱)

—— ۲/جولائی ۔ بھٹو ۔ پریس کانفرنس میں سمجھوتہ ہونے کے بعد دس نکات اور بڑھا دیئے ہیں۔ پس معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ (ص ۔ ۲۴۳)

—— ۴/جولائی ۔ اخبارات اور ریڈیو سے بات آ گئی کہ مذاکرات بحران کا شکار ہو گئے ہیں۔ (ص ۲۴۹)

---

[1] قومی اتحاد کا بقالانہ طریق کار بھی کمال ہے ۔ یہ تو ساری سلطنت دے کر بھی شاید بات طے نہ کر سکتے ۔ واضح رہے کہ انتخابی اصطلاحات کی رپورٹ کے دس بیس مطالبے بنتے ہیں ۔ اسی طرح عام معاہدے کی ۳۰ شقیں تھیں ۔ کل کا مؤرخ یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ قومی اتحاد کے لیڈر بھی مارشل لا کے نفاذ کا بالواسطہ ذریعہ بنے۔

——— ۴ جولائی - اصغر خاں - اب "اُس" کے عزائم بڑے خطرناک ہیں۔[1]

——— ۴ جولائی - قومی اتحاد کے اجلاس میں بدمزگی - اکثریتی تاثر کہ مذاکرات کو توڑا نہ جائے - آئندہ جمعہ سے تحریک شروع کی جائے (ص ۲۵۳)

——— ۴ جولائی - رات کھانے کے بعد - نوابزادہ صاحب نے کہا: "وہ بہت دور تک گیا ہے - اس نے ہماری تمام باتیں مان لی ہیں لیکن ہم RE-OPEN کرنا چاہتے ہیں - یہ لاسٹ منٹ بارگیننگ، لمحۂ آخر تک کی سودا بازی ہے" - (ص - ۲۵۰)

——— ۴ جولائی - نیم شب، گرفتاریاں ——— مارشل لا -

یہاں آکر پروفیسر صاحب سے سہو ہوا - اس وقت معاملہ دو خطروں کے بیچ لٹک گیا تھا - ایک یہ کہ اسی رات کو (۴ و ۵ کی درمیانی رات) ایف، ایس - ایف، اور تقسیم شدہ اسلحہ اور غنڈہ فورس کو استعمال کر کے مخالف لیڈروں کو قتل کر وا دیا جائے، دوسری جانب مارشل لا تھا - فوج نے پہلے خطرے کے لیے میدان کھلا چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا - اور حالات کو گرفت میں لے لیا - یہاں اس فقرے کے معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ "اس کے عزائم بڑے خطرناک ہیں" - بلکہ یہ بات ان دنوں بہت شائع و ذائع تھی کہ حکومت نے چند بڑے مخالفین کا صفایا کرنے کا پروگرام بنا لیا جائے - سمجھوتہ نہ ہونے کی صورت میں جلد سے جلد اس پر عمل کیا جائے گا - اس فیکٹر کو چاہے یہ غلط ہو یا مبہم زیر بحث لایا جانا چاہئے تھا - اس کے بغیر اس وقت کی پوزیشن اور فیصلوں کو سمجھنا ناممکن تھا۔[2]

---

[1] افسوس کہ مؤلف کتاب نے نہ اس کی وضاحت کی اور نہ اس کی مشہور رئ عام کا کوئی نوٹس لیا اور نہ اس فیکٹر کو مارشل لا لگنے میں محسوس کیا -

[2] ایک رات مسٹر کھر اور پیرزادہ نے کہا کہ اپوزیشن شرارت سے باز نہیں آتی - اس کے لیڈر فتنے اٹھا رہے ہیں - ہم ان سب کو تباہ کر دیں گے - مسکانوں کے لب و لہجہ میں اور بھی تبدیلی تھی - ان کا ارشاد تھا کہ دس بیس ہزار افراد پالیسی کی خاطر (یعنی پیپلز پارٹی گورنمنٹ کی خاطر) قتل بھی کر دینے پڑیں تو کوئی بڑی بات نہیں "

ایک رات کابینہ کی میٹنگ [illegible] جنرل صاحب کو دعوت دی گئی کہ آپ بھی اقتدار میں (باقی برصفحہ آئندہ)

لیکن بہ حیثیت مجموعی ہمارے برادرِ معظم نے بہت قابلِ قدر کام کیا ہے۔ عملی سیاست گر ہونے کی وجہ سے کم توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک مربوط کتاب لکھیں۔ لیکن انھوں نے بہت خوب کتاب لکھی اور اس میں ایسی یادداشتیں جمع کر دیں جن کے بغیر کل ہمارے اس دور کی تصویریں مکمل طور پر تیار نہ ہو سکتیں۔

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

شامل ہو جائیں...... بس ایک بار اپوزیشن کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ (دیکھیے جولائی کی رات)

ایسی ہی باتیں ۲ جولائی کی رات کو بھی ہوئیں۔

بعد میں متعدد ذرائع سے معلوم ہوا کہ مسٹر بھٹو نے مجھے فوج کی سربراہی سے سبکدوش کر دینے کے بارے میں دو تین بار سوچا تھا۔

انٹرویو جنرل محمد ضیاء الحق

(برائے اُردو ڈائجسٹ۔ گفتگو: الطاف حسن قریشی، مورخہ ۶ ستمبر ۱۹۷۷ء)

خود میری ذاتی یادداشتیں یہ ہیں کہ فوج کے جو آفیسر ڈیوٹی پر تھے، وہ افسران کی تحریک کا جائزہ بھی لے رہے تھے اور ساتھ ساتھ عام لوگوں کا ردِ عمل بھی معلوم کر رہے تھے۔ اس وقت دو باتیں عام طور پر مشہور تھیں: ایک یہ کہ ایف ایس ایف کو اسلحے سے تیار کر دیا گیا ہے کہ وہ قومی اتحاد کے لیڈروں کو ختم کر دے اور جب معاہدے کی ناکامی کا مایوس کن تاثر بڑھا تو خاص طور پر ۴ اور ۵ جولائی کی رات کے بارے میں یہ تاثر بڑے اور چھوٹے لوگوں میں عام تھا کہ اسی رات قتل مقاتلہ کرایا جائے گا۔ دوسری بات اس کے ساتھ ساتھ یہ پھیل گئی تو چند لیڈروں کے کہہ دینے کے بعد عام لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اس بلا سے جان چھوٹے تو ہم مارشل لا کو بہتر سمجھتے ہیں۔

اور اگر ۴/۵ جولائی کی رات کو فوجی اپریشن نہ ہوا ہوتا تو ضیاء الحق صاحب کی چھٹی کے علاوہ ایف ایس ایف کی گولیاں نشانہ[illegible] کی سالاری میں نہ جانے کس کس دل و جگر میں چبھ چکی ہوتیں۔

سوال یہ ہے کہ قومی اتحاد کی لامتناہی گفتگوؤں کے انتظار میں فوج کیسے بیٹھی رہ سکتی تھی جب کہ قوم کی [illegible] بہ رہی تھی۔ اس پہلو سے کتاب میں ضروری ورق خالی رہ گیا۔

اب ذرا دوسرا پہلو!

بعض لوگوں نے قومی اتحاد اور بھٹو حکومت کے درمیان ہونے والی مصالحتی گفتگوؤں کو نظیر اور دلیلِ جواز بنایا ہے[1] پروفیسر غفور صاحب اور جماعت کے بعض دیگر پالیسی ساز اکابر کی حالیہ گفتگوؤں کے لئے جو انہوں نے پچھلے کچھ عرصہ میں پیپلز پارٹی سے جاری رکھیں اور پھر جن سے ایسے نتائج برآمد ہوئے جنہوں نے ہمارے کام پر بُرا اثر ڈالا۔

اعتراض ہونے پر کہا گیا کہ پیپلز پارٹی سے تو ہم پہلے بھی گفت و شنید اور معاہدانہ کوششیں کرتے رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ لوگوں میں اتنی منطق نہیں پائی جاتی کہ وہ ایک نظیر یا دلیل یا تشبیہ کا انطباق کسی دوسرے معاملے پر کرتے ہوئے فوراً اُس وجہِ مغالطہ انگیزی کو پکڑ لیں جو چھپی چھپائی رہتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اس ناکام معاہدے کی مساعی میں جماعت اسلامی کی ذمہ داری کہاں تک ہے؟ بس اتنی ہی کہ نویں عقدے کی حد تک اِدھر کا ایک آدمی بھی شریک تھا۔ ورنہ اس قصے کا کوئی تعلق جماعتی اُصول و روایات اور نظم اور ریکارڈ سے نہ تھا۔ پھر بھی واضح قسم کا ٹکراؤ ہماری روایات اور اقدار سے نہ تھا۔

دوسرا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ وہاں بات چیت ایک حکومت سے تھی اور ایسی بات چیت ہر حکومت بلکہ لادین حکومت حتیٰ کہ تاتاریوں اور خارجیوں کی حکومت سے بھی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ جو حکومت عملاً (DEFOCTO) مسلط ہو، اس پر چونکہ ایک اہم رشتہ (جبراً سہی) عوام اور شہریوں سے قائم

---

[1] جواز نکالنے والے بھی کمال کرتے ہیں۔ بعض اصحاب نے حالیہ قضیۂ مفاہمت پر "صلح حدیبیہ" کے قصے کو چسپاں کر ڈالا، جسے نبیؐ اکرم نے خدا کی ہدایت کے مطابق انجام دیا۔ کہاں نبیؐ، کہاں اس کے مقدس ساتھی، اور کہاں ہماری پستیاں۔ نبیوں کے کاموں کو اپنے اوپر چسپاں کرتے ہوئے احتیاط کرنی چاہیے۔ خدانخواستہ اونچے مقدس واقعات کو ہم مذاق بنا کر رکھ دینے کی گستاخی کے مرتکب نہ ہوں۔

یہاں پھر بڑی مغالطہ انگیزی ہے۔ حضورؐ قریش سے یہ طے کرنے نہیں آئے تھے کہ ہم مل انتخاب لڑیں یا حکومت چلائیں گے۔ وہ تو طواف کے لیے مکے میں جانے کے لیے آئے تھے۔ اس پر دشمن قوت نے سمجھوتہ یہ کیا کہ اگلے سال آپ طواف کر سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ دوسری شرائط بھی تھیں۔

ہو جاتا ہے اور شہریوں کے حقوق کے علاوہ روزمرہ کے دوسرے معاملے اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا سلطانِ وقت یا حاکمانِ وقت سے بات کرنا اور چیز ہے۔ مثلاً کسی شخص کو راشن کارڈ بنوانا ہے، یا پاسپورٹ لینا ہے، بچے کو داخل کرانا ہے تو اس حکومت کے ایک شعبہ میں جائے گا ــــ وہاں کام نہ ہو یا خراب ہو تو وہ اُوپر یا اُس سے اوپر اور بالآخر حاکمِ اعلیٰ تک پہنچے گا یا کوشش کرے گا۔

دوسری طرف یہ معاملہ بالکل الگ ہے کہ آپ ایک یا دو پارٹیوں سے مل کر انتخابی سمجھوتہ کریں اور وہی انتخاب جس کو آپ جہاد کہتے ہیں وہ ایسے لوگوں کے ساتھ لین دین کر کے لڑیں، جو مخالفینِ اسلام لادینیت کے علمبردار، فسطائیت و آمریت کے مجرم، قتل اور غنڈہ گردی کے ذمہ دار، قومی دولت پر علانیہ ہاتھ صاف کرنے والے اور ہجومی سیاست کے مظاہروں میں حرکات و سکنات اور سلوگنوں اور نعرہ بازی کے لحاظ سے غیر شائستہ ہوں۔ ان لوگوں کے ساتھ کسی قومی اتحاد میں شریک ہو کر یا براہِ راست ہم آہنگی یا ہم پیالگی و ہم نوالگی، یا ہم قدمی و ہم نوائی پیدا کرنا حق و باطل میں التباس پیدا کر کے عوام کو اس سے مایوس کرنا ہے کہ اسلام کے کوئی اصول اور اس کی قدریں اور ضابطۂ معاملات مستقل اور دائمی بھی ہیں۔ یا قرآن کے آدمی اور محمد رسول اللہ کے نقیب و شاہد کا کوئی غیر متبدل مزاج بھی ہوتا ہے۔

معذرت خواہ ہوں کہ مجبوراً اس اہم کتاب کے تبصرے کے خاتمے پر یہ متعلقہ مسئلہ مجھے چھیڑنا پڑا۔ ایک اور کمی اس اہم کتاب میں رہ گئی ہے۔ وہ یہ کہ جماعتِ اسلامی جن اتحادوں اور متحدہ محاذوں میں شریک ہوتی رہی۔ ان کے خطوطِ اتحاد میں ایک نہ ایک جامع شق ہمارے اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق موجود رہتی۔ جمہوریت وغیرہ سب ثانوی درجے پر ہوتیں جنہیں بعض دوسرے لوگ اوّلیت دیتے ہوں گے۔ مگر ہم سب پہلے اسلامی بنیاد کو تسلیم کرا لیتے تھے۔ پروفیسر صاحب اپنی کتاب میں جہاں پاکستان قومی محاذ کے قیام (مورخہ ۱۰ / جنوری ۱۹۷۷ء) کا ذکر کیا ہے (ص ۸۶)، وہاں سرے سے اساسیاتِ اتحاد کا ذکر نہیں ہے۔ یہ بہت ضروری تھا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ آج بہت سے لوگ سیاست بلا دین یا ایسی سیاست جس میں دین کی کم سے کم

(باقی بر صفحہ ۴۵)

رسائل و مسائل

ازدواجی زندگی کے متعلق بعض تلخ حقائق

یہ خط ۱۹۸۶ء کی دوسری سہ ماہی میں مجھے ملا تھا۔ اس کا جواب لکھ کر میں نے مکتوب نگار خاتون سے پوچھا تھا کہ اسے شائع کردوں یا نہیں۔ ان کے والد مکرم کی طرف سے مشورہ دیا گیا کہ فی الحال نہیں۔ بعد میں حالات اور بھی ابتر ہوگئے اور ایک اور خط موصول ہوا کہ جس کے ساتھ یہ اجازت بھی دی گئی کہ نام، مقام بتائے بغیر آپ شائع کرسکتے ہیں۔ سو میں یہ دردناک اور عبرت انگیز خط اور اس کا جواب شائع کر رہا ہوں۔ ذرا خیال کیجیے، کیسے والدین کی نیک نہاد بیٹی اور کیسے صاحبِ حیثیت بھائیوں کی بہن کس طرح ایک جانورستان میں ڈال دی جاتی ہے۔ کاش کہ مصلحین معاشرہ، داعیانِ اسلام، نقیبانِ تعلیم و ادب اور منظمات خواتین و طالبات اس بارے میں غور کریں کہ جو لاکھوں عورتیں جاہلیتِ مروّجہ کی درندگی کی بھینٹ ہر روز چڑھ رہی ہیں، ان کے لیے آپ سب کیا کرسکتے ہیں۔

سوال: میں الحمدللہ ایک تعلیم یافتہ مسلمہ بیوی ہوں اور بفضلہ تعالیٰ دین کی فہم و عمل کے لیے ہمہ وقت کوشاں و ساعی بھی ہوں۔ تقریباً پانچ برس پہلے میری شادی ہوئی۔ یہ لوگ ہماری قریبی برادری کے نہیں، البتہ محلے کے آشنا اور مقابلتاً دینی افہام و تفہیم رکھنے والے تھے۔ میرے شوہر کے والد مسجد کی نسبت سے میرے نانا کے دوست تھے اور ان کی بڑی بہن دورانِ تعلیم جمعیت کی تربیت بہ اہتمام پوری کرکے گھر میں درسِ قرآن تک خود دیتی تھیں۔ ایسی ہی دیگر وجوہ سے میرے گھر والوں نے میرا رشتہ مان لیا تھا ــــــ بلکہ انہوں نے "توکلت علی اللہ" اس خاندان کے ظاہری دینی فہم ہی کو دیکھا تھا۔

میرے اس وقت تین بچے ہیں۔

میں جس گھر میں شوہر کے ساتھ رہتی تھی وہاں اس کی ایک بیوہ بہن اپنے چار بچوں کے ساتھ، بڑے بھائی ان کی بیوی اپنے سات بچوں کے ساتھ اور اُن کی ایک اور بہن (جو اب شادی ہو کر جا چکی ہیں) رہتے تھے۔ میرے شوہر اور میرے حصے میں رہائش کے لیے فقط ایک کمرہ دوسری منزل پہ سائز تقریباً (۱۵ × ۱۲ فٹ) بمعہ باتھ رُوم اور ایک عارضی چھت سے بنا ہوا باورچی خانہ تیسری منزل پہ ہے۔ میرے شوہر کو ہمہ وقت احساس ہے کہ ہمیں موزوں رہائش میسر نہیں۔ اس چھوٹے سے دو منزلہ گھر میں (مجموعی رقبہ آٹھ مرلہ یا ۲۴۰ گز) میں اور ماشاءاللہ کم و بیش بیس (۲۰) افراد کی آبادی میں معاشرت اس قدر آسان اور پُرامن نہیں ہوسکتی۔ کچھ میرے شوہر کے رشتہ دار جو اس گھر میں رہتے ہیں جب کبھی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں تو مجھ پر بھی یہ پابندی لگتی ہے کہ میں بھی ان کے باہمی حریف یا حریفوں کے ساتھ قطع کلام کرلوں ورنہ یہ لوگ کبھی کوئی اور کبھی کوئی مجھ سے بھی ناراض ہو کر ظلم کی حد تک جھگڑا کرتے ہیں، بلکہ فوراً ہی میرے شوہر تک کو بھڑکا کر میرے والدین کو فون کرا دیتے ہیں کہ ”اسے آکر لے جائیں..... اس کا ہمارے گھر میں یا میرے ساتھ گزارا نہیں“۔ میرے والدین الحمدللہ گھر میں قرآن کا حکم اللہ کے پیارے نبیؐ کی اتباع میں نافذ کیے ہوئے ہیں۔ میرے والد سعودی عرب سے تیس (۳۰) سال بعد گھر آچکے ہیں۔ بھائی اور بہن دنیاوی اعلیٰ تعلیم (انجینیر امریکہ سے اور ڈاکٹر وغیرہ) کے ساتھ ساتھ دینی فہم سے آراستہ ہر ہر سنتِ نبوی کو بجا لاتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ صبر کیا، مجھے لینے نہیں آئے اور یہی کہا کہ ہر معاملہ میرے شوہر کے خاندان والے اپنے ہی گھر میں اللہ کے حکموں اور شریعتِ مطہرہ کی رہبری و رہنمائی میں طے کیا کریں۔

اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز شدید غصے میں میرے شوہر نے مجھے جسمانی اذیت بھی دی۔ اور کہا کہ ”میرے گھر سے فوراً نکل جاؤ، ورنہ میں دھکے دے کر تمھیں باہر نکال دوں گا“۔ اُدھر میرے سامنے میری ماں سے فون پہ کہا کہ میں نے تمھاری بیٹی کو کہہ دیا ہے کہ میرے ساتھ اس کا گزارہ نہیں، آپ آکر اسے لے جائیں، ورنہ وہ اگر کہیں اِدھر اُدھر چلی گئی تو میں ذمہ دار نہ ہوں گا“۔ میری ماں نے حسبِ معمول صبر کیا اور جواب دینے سے گریز کیا۔

میں نے برقعہ پہنا اور شوہر سے کہا کہ آپ بچوں کو رکھ لیں میں اکیلی چلی جاتی ہوں" میرے شوہر نے کہا کہ "تم بچوں کو بھی ساتھ ہی لے جاؤ۔"

آج تین ماہ ہوگئے، میں ماں باپ کے گھر رہتی ہوں۔ اِس دوران میرے شوہر نے یا اُس کے کسی رشتہ دار نے کسی قسم کی معقول مصالحت طلب نہیں کی اور نہ کبھی کسی سے میرے کسی بچے تک کی خیریت معلوم کرنے کا سوچا۔ اِدھر اُدھر کے لوگوں سے باتیں کرتے رہے ہوں گے جن کا کچھ حصہ میرے والدین کو بھی پہنچا تھا۔ مگر چونکہ کوئی تصفیہ طلب یا مستقل حل تلاش کرنے کی سعی نہ ہوئی لہٰذا میرے والد چپ رہے۔

کل رات میرے شوہر اپنے بڑے بھائی اور اپنے ایک دوست کے ساتھ میرے والد کے پاس آئے اور بضد ہوئے کہ " لڑکی کو ہمارے ساتھ بھیج دو" میرے والد نے ان لوگوں سے معقول اور دیرپا حل کی تجویز مانگی تو انہوں نے کہا کہ یہ میرے شوہر کا حق اور فیصلہ ہے کہ اس کی بیوی وہیں رہے گی جہاں سے آئی ہے۔ کیونکہ شوہر کا مقام بیوی کے لیے اطاعت کا ہے لہٰذا اس ضمن میں کسی قسم کی چوں وچرا نہ ہونا چاہیے۔ "خدا کے بعد شوہر حاکم ہے"۔

میرے والد کا کہنا ہے کہ چونکہ فریقین اپنے تجربے اور مشاہدات سے جان چکے ہیں کہ بیٹی شوہر کے موجودہ گھر اور اس کی آبادی میں رہتے ہوئے اذیت اُٹھاتی رہی اور ہمیں بھی اس کے شوہر کی بہنوں نے اور خود شوہر نے بھی ہمیشہ مطعون کیا ــــ اور مزید یہ کہ چونکہ بیٹی کو شوہر نے گھر سے نکالا، نہ کہ وہ از خود اس کا گھر چھوڑ کر باپ کے گھر آئی ہے ــــ تو اب اس کا یہ حق اللہ کے ہاں محفوظ ہے کہ وہ اپنے شوہر سے یہ طلب کرتی ہے کہ وہ اسے ایسی رہائش مہیا کرے جو اکیلی اس کے اپنے لیے اور شوہر اور بچوں کے لیے ہو۔ چاہیے ایک جھونپڑی ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ مزید برآں وہ جیسے کیسے بھی صبر کے ساتھ گزارا کرے گی کیونکہ اُسے ذہنی طور پر امن تو ہوگا۔ حسد وبغض کی فضا نہ ہوگی اور اس طرح گھر آئے ہوئے کبھی شوہر کے رشتہ دار مہمانوں کی بھی وہ بہتر خدمت اللہ کی اطاعت کی روشنی میں انشاء اللہ کرتی رہے گی۔

اِس پر شوہر کے بڑے بھائی برہم ہوئے اور کہا کہ ہم سُسر کی تجویز کیوں مان لیں

اس پر میرے والد نے حاضرین کی توجہ ضمیر اور نفس آمارہ کے فرق کی جانب مبذول کرائی اور کہا کہ چونکہ فریقین کی مخلص نیت قضیے کی وجوہات کے پیش نظر ایک مستقل و دیرپا تصفیے اور حل کی مساعی کی جانب ہونا چاہیے۔ لہٰذا ضمیر کی آواز کو لبیک کہتے ہوئے یہی حل زیادہ قرین ہوگا کہ شوہر اور بیوی اپنے بچوں کے ساتھ الگ ایک رہائش حاصل کر کے رہیں کہ جو موجودہ چھوٹے سے گھر اور بڑی آبادی سے مختلف ہوگی اور جہاں عورتوں کے کسی بھی چھوٹی بڑی بات کا بہانہ لے کر لڑنے کا ماحول یا سبب قطعی نہ رہے گا۔ اس کے برعکس اگر ایک فریق محض اپنی انا کو لے کر ضد کرے گا اور مستقل و دیرپا حل کی تلاش نظر انداز کرتے ہوئے آج سے تین ماہ قبل ہی کے حالات میں مجھے دھکیل دے گا تو یقیناً یہ حل تو نہ ہوا بلکہ اب کے بعد شوہر کی بہنیں اور رشتہ دار، بلکہ بڑے بھائی بھی مزید اذیت مجھ کو دیں گے اور فضا کبھی سازگار نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

اب استفسار یہ ہے کہ کیا میرا بحیثیت بیوی کے اپنے شوہر سے یہ الگ رہائش کا مطالبہ کرنا شریعت محمدیہ کی رُو سے درست یا مناسب ہے یا حکماً (بہ اطاعتِ شوہر) مجھے انہیں حالات میں واپس چلے جانا چاہیے۔ جہاں میرے لیے فضا یقیناً پہلے سے بھی زیادہ تنگ کر دی جائے گی۔ اللہ جانتا ہے میں نے ہمہ قسم کی دُنیاوی قربانی کر کے بھی شوہر کی بہنوں اور رشتے داروں کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی ہمیشہ کی ہے جو مجھے کبھی اگر ملی بھی تو بہت عارضی طور پر۔

یہ لوگ کافی حد تک خود پسندی میں مبتلا ہیں۔ اللہ کا خوف بہت کم ہے۔ فرائض کے کسی حد تک پابند ہیں، مگر دین کے معاشرتی تقاضوں کا عملی فہم اِن لوگوں میں مفقود ہے یا شاید نفس اور دُنیا سے مغلوب ہیں۔

جواب :۔ میں نے آپ کا خط پڑھا۔ میں کوئی مفتی نہیں ہوں اور فتویٰ نہیں دے سکتا۔ رواجی فتویٰ لینا ہو تو کسی مناسب آدمی سے رجوع کریں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے آپ کے بیان پر اعتماد کر کے لکھا ہے۔ میں تو شرعی اُصولوں اور اصطلاحوں اور احکام کو معاشرے کے احوال کے اندر رکھ کر سوچتا ہوں، ہر بگاڑ کا تجزیہ کرتا ہوں اور یہ سمجھ سکتا ہوں کہ ہمارا ہر بگاڑ اسلام کو نہ سمجھنے اور اس پر عمل نہ کرنے

کی وجہ سے ہے۔

جہاں تک ازدواجی زندگی کے معاملات کا تعلق ہے، ہم سب لوگ باہم ٹکرانے والی دو جاہلیتوں کے درمیان پس رہے ہیں۔ خاص طور پر سیدھی سادی مسلمان عورتوں کی جن اذیت ناک داستانوں سے میں آگاہ ہوا اور جیسے جیسے حالات کے بارے میں مجھ سے سوالات پوچھے جاتے رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے میرے دل پر بڑا بوجھ رہتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں شوہروں کی وہ اکثریت جو قدیم یا جدید جاہلیت پر مبنی عائلی نظام کو لے کر چل رہی ہے۔ بالعموم عام انسانی شائستگی سے بھی عاری ہے۔ ستم یہ کہ ایسے شوہر اسلام کے تمام احکام کو روند کر، اسلام کے اندر سے اپنے لیے یہ حکم نکال لیتے ہیں کہ بیوی کو ان کا ہر حکم، ہر قسم کے حالات میں ماننا چاہیے۔ اور ذرا بھی چوں وچرا نہیں کرنی چاہیے۔ بیویوں کے لیے ان کا نقطۂ نظر اس سے بدتر ہے جو قدیم دور میں کسی شریف آدمی کا لونڈی کے متعلق ہوتا تھا۔ ازدواجی زندگی میں اسلام جو کچھ مطالبے ان سے کرتا ہے، وہ انھیں پورا نہیں کرتے البتہ فریقِ ثانی سے چاہتے ہیں کہ وہ ان کے فرامین کی تعمیل کرے۔ بیچاری ستم کش عورتیں طلاق جیسے بھاری ظلم سے بچنے کے لیے ہر حکم کی تعمیل کرتی ہیں اور ہر ظلم سہتی رہتی ہیں۔ معاشرہ اس عورت کے گُن گاتا ہے جو ظلم کی چکی میں بے چون وچرا پس جائے اور پستے پستے عمر گزار دے۔ ان حالات کا ردِعمل یہ ہے کہ آہستہ آہستہ وہ ماڈرن عورت اُبھر رہی ہے اور سینہ تانے آگے بڑھ رہی ہے جو نہ دین کو مانتی ہے، نہ معاشرے کے آگے جھکتی ہے اور نہ شوہر کی اطاعت کا اُصول تسلیم کرتی ہے۔ اس جاہلیتِ جدیدہ کو پیدا کرنے والی ماں وہ جاہلیت قدیمہ ہے جس نے گھروں پر اپنا تاریک سایہ پھیلا کر ان کو دوزخ بنا دیا ہے۔[۱]

---

[۱] یہ وضاحت کر دینا میرے لیے ضروری ہے کہ بگاڑ صرف خاوندوں ہی میں نہیں، بیویوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہوتی ہیں جو حفظِ عصمت اور اخفائے زینت کا فریضہ ادا نہیں کرتیں۔ اور اس معنی میں ناشِزہ (سرکش) ہوتی ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو شوہر کے مقام کو اسلامی ہدایت کے مطابق تسلیم نہیں کرتیں اور مساوات کا غیر شرعی گستاخانہ انداز اختیار کرتی ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو شوہر سے زیادہ روپیہ کمانے اور زیادہ اچھے کپڑے اور زیور اور گھر کے سازوسامان حاصل کرنے کے لیے دباؤ ڈالتی رہتی (باقی برصفحہ آئندہ)

آپ کسی مفتی کے ہاں جائیں تو وہ مسئلہ بیان کرتے ہوئے نہ شریعت کی پوری اسکیم کو سامنے رکھے گا اور نہ معاشرے کے نقشۂ احوال کو۔ وہ تو بس مقررہ الفاظ میں لکھ دے گا: "یجوز" یا "لا یجوز" (کذا فی الشامی اور کذا فی ردّ المختار) اور آخر میں "واللہ اعلم بالصواب" عورت جو ظلم کے دریا میں ڈوبتی ہوئی پکار رہی ہے۔ اس کو کوئی فتوٰی ڈوبنے سے بچا نہیں سکتا۔ عدالت میں جائیں تو پرسنل لا کے لگے بندھے قواعد مشینی طور پر کام کریں گے اور سٹیریو ٹائپ حکم جاری ہو جائے گا۔ (دیگر مشکلات اور مداخلتیں در کنار) معاشرے میں ڈھرا رہیں تو رسمیات کے بندھنوں میں بندھا ہوا معاشرہ شوہر ہی کی پشت پناہی کرے گا۔ کیونکہ وہ اس کی نگاہوں میں مجازی خدا ہے اور عورت کا تو مقام ہی اس کی نگاہ میں صبر سے پسنا ہے۔

میں آگے چل کر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ازدواجی زندگی اور مرد و عورت کے تعلقات کی اسپرٹ کیا ہے۔ اور مرد کی قوامیت یا ایک "درجہ برتری" کا کیا مطلب ہے اور وہ حکم دینے اور اطاعت کا مطالبہ کرنے میں، نیز مار پٹائی میں کیا اختیارات رکھتا ہے۔ مگر بڑی مشکل یہ ہے کہ گھریلو معاملات کی اصلاح باہر سے پولیس اور حکومت اور عدالت بھی نہیں کر سکتیں، جیسے کہ آج کل مغربی ممالک اور خود امریکہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ عورتوں کی ایک بڑی تعداد مردوں کے ہاتھوں سے ہر روز پٹتی ہے آخر اسے کیا مدد دی جا سکتی ہے۔ اب تک تو قانون اور پولیس عاجز ہیں۔ اس لیے اسلام کی اسکیم بنیادی طور پر یہ ہے کہ انسانوں (مردوں اور عورتوں) کے دل و دماغ کو اندر سے بدلا جائے اور ان کے حیوانی جذبات کی قوت توڑ کر اعلیٰ انسانی جذبات کا غلبہ قائم کیا جائے۔ جہاں تک ایک شخص تنہائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

ہیں اور ناجائز آمدنیاں پیدا کرنے کے لیے تنگ کرتی ہیں، کچھ وہ ہیں جو شوہروں کو ماڈرن ازم پر مجبور کر کے انہیں دعوتوں اور کلبوں اور تقریبوں میں اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہتی ہیں، کچھ وہ ہیں جو شوہر کی طرف سے نماز روزے کی تلقین پر لڑائی شروع کر دیتی ہیں، اور کچھ وہ ہوتی ہیں جو شوہروں سے گستاخانہ رویہ رکھتی ہیں۔ بدزبانی کرتی ہیں اور عدم تعاون کرتی ہیں۔ عورتوں کی یہ ساری اقسام اسلامی نظام معاشرت کو تباہ کرنے اور گھر کی دنیا کو فاسد بنانے میں پوری طرح ذمہ دار ہیں۔

میں بھی خدا و رسولؐ کی تعلیمات سے روگردانی کرنے پہ تیار نہ ہو[1] یہ ایمانی قوت اگر اندر سے اخلاقی احساس کو نہ ابھار سے تو میری یہ تحریر یا کسی مفتی کا فتویٰ آپ کو کیا حقیقی مدد دے سکتا ہے۔ آپ کے شوہر صاحب ہر ایسی چیز کو جانے سمجھے بغیر اٹھا کے پرے پھینک سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو خدا کی پروا نہ ہو، ان کو ہما شما کا کیا لحاظ؟

بہرحال ازدواجی زندگی کے سلسلے میں میں چند اہم اسلامی حقائق آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ لامحدود اور غیر مشروط اطاعت سوائے خدا کے کسی کی بھی نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ خدا تعالیٰ بھی آدمی کی مشکلات اور مجبوریوں کے لحاظ سے مردوں اور عورتوں کو بہت سی رعایات دیتا ہے، بعض احکام کو نرم کر دیتا ہے، بعض مطالبات کو ساقط بھی کر دیتا ہے۔ اس کے بعد سب سے بڑی اطاعت جو اللہ کی اطاعت کے تحت کرنی ہوتی ہے۔ وہ نبیؐ کی ہے۔ اس کے لیے بھی "فی المعروف" کی شرط ہے۔ باقی ساری اطاعتیں تو نچلے درجے کی ہیں۔ کسی حکمران، امیر یا لیڈر کو اپنے تمام احکام منوانے کا عمومی حق حاصل نہیں ہے۔ کوئی آقا اپنے غلام پر، معلم اپنے شاگرد پر، افسر اپنے ماتحت پر، جاگیردار اپنے کسان پر، کارخانہ دار اپنے مزدور پر، والدین اپنی اولاد پر ایسے حاکم نہیں ہیں کہ اندھی اطاعت کا مطالبہ کریں۔ یہی حال ایک شوہر کا اپنی بیوی کے لیے ہے۔ وہ ہر قسم کے معاملات میں ہر حکم نہیں منوا سکتا۔ بیوی پر حکم چلانے اور سختی کرنے کے لیے شریعت کے کچھ اصول و حدود ہیں۔ خدا کی شریعت میں کسی کے لیے بھی ایسی کھلی چھوٹ نہیں کہ وہ جس کے ساتھ جو چاہے کرے اور دوسرے سے جو جی چاہے منوائے۔

---

[1] یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ تعمیر انسانیت کی اس اسلامی اسکیم کے مطابق مدتوں سے بھرپور کام نہیں ہو رہا۔ علاوہ ازیں ازدواج کے لیے لوگوں نے دینی و اخلاقی معیارات سے ہٹ کر کچھ دوسرے معیارات کو اہم قرار دے لیا ہے اور بالعموم رشتے غلط جگہوں پر ہوتے ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے معاملے میں تو خاصی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔ تاہم سعیٔ اصلاح کی کوشش کا ایک راستہ یہ ہے کہ خدا پرست اور دیندار اور شریف افراد کو تلاش کیا جائے، خواہ وہ غریب ہوں۔ اس ضرورت کے لیے اسلامی جماعتیں مضبوط نئے معیارات و روایات بنا سکتی تھیں، مگر وہ سب بھی تو دریا کے وقت میں غوطے کھاتے ہوئے بہ رہی ہیں۔ ان موجوں سے کوئی بسلامتی باہر نکلے تو وہ سوچے۔

۲ — اسلام نے ازدواجی رشتے کا جو مزاج مقرر کیا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ ایک دفتری نظام ہو جہاں ایک طرف سے حکم جاری ہوتے رہیں اور دوسری طرف سے فدویانہ زبان میں عرضی پرچے لکھے جائیں۔ ازدواجی زندگی کوئی کاروباری معاملہ ہے۔ یہ رابطہ رفاقت کا ہے، دوستی کا ہے اور رحمت و مودت کا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (البقرہ: ۱۸۷) اور تم ان کے لیے اور وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ یعنی تم ایک دوسرے کے پردہ پوش، ایک دوسرے کی عزتوں کے رکھوالے اور ایک دوسرے سے انتہا درجے کی قرابت رکھتے ہو، کیونکہ لباس اور بدن میں کوئی تیسری چیز حائل نہیں ہوتی۔ صاحبِ لباس اپنے لباس کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر کہیں سے کپڑا چھد جائے تو اُسے اس طرح رفو کرتا ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ جسم اور لباس کی یہ مثال قرآن نے دونوں فریقوں پر برابر برابر چسپاں کی ہے۔

اسی حقیقت کے قریب لے جانے میں قرآن کے یہ الفاظ بھی مدد کرتے ہیں کہ انسانی نوع کے لیے اسی نوع کا جوڑا اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ "لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا" (الاعراف - ۱۸۹) حدیث میں اسی کی تشریح ہے کہ "وَإِنْ نَظَرَ إِلَيْهَا سَرَّتْهُ" (مشکوٰۃ - جلد ۲ - کتاب النکاح - فصل اول - روایت ابی امامہ) - لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا کا اطلاق دونوں صنفوں کے افراد پر ہوتا ہے۔ لیکن اگر اُسے بیوی کے لیے مختص قرار دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ جس عورت کو اس کا شوہر کبھی ضروریات سے محروم رکھ کر، کبھی ذہنی اذیت دے کر، کبھی فریضۂ تحفظ ادا کرنے میں کوتاہی دکھا کر، کبھی مار پیٹ کر اور کبھی گھر سے نکال کر پریشان حال رکھے تو وہ سرمایۂ تسکین اور وسیلۂ مسرت کیسے بنے گی۔ رحمت و محبت اور تسکین و مودت کی فضا کو اگر شوہر تباہ کر دے تو پھر خالی اس کے حکم احکام جاری کرنے سے تو زندگی نہیں سنور سکتی۔

گھر کوئی پولیس اسٹیشن نہیں ہوتا کہ تھانیدار صاحب ڈنڈا ہاتھ میں لیے حکم چلا رہے ہوں۔ گھر آدمی کے لیے زمانے کی کلفتوں، دُکھوں، جھگڑوں اور ہنگاموں کے مقابلے میں ایک پناہ گاہ ہوتا ہے۔ جہاں ایک فریق اعتماد کر کے دوسرے کا اعتماد حاصل کرتا ہے، شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو محبت کا ہدیہ پیش کرتے ہیں اور جواب میں محبت پاتے ہیں — باہمی ہمدردی، باہمی ایثار، باہمی خیرسگالی اور باہمی عزت کا ایک نظام ہے جس کے لیے ازدواج قائم ہوتا ہے اور گھر بنتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا:

"تم میں سے بہتر آدمی وہ ہے جو اپنے اہل وعیال، اعزہ واقربا اور خدام کے ساتھ نیک سلوک کرے اور اخلاق سے پیش آئے اور میں اپنے اہل وعیال کے حق میں تم سب سے بہتر ہوں" (مشکوٰۃ۔ باب عشرۃ النسا ۔۔۔ فصل دوم، بروایت حضرت عائشہ رضؓ)

اسی کے ساتھ اگر وہ ارشادات بھی سامنے رکھے جائیں جو غلاموں کے متعلق آپ نے فرمائے۔ مثلاً یہ کہ اپنے غلام کو روزانہ ستر مرتبہ معاف کرو، یا یہ کہ نمازی غلام کو مارنا درست نہیں۔ ان چیزوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضورؐ نے تشدد اور ایذارسانی تو غلاموں کے بارے میں بھی پسند نہیں کی، کجا کہ بیویوں کے بارے میں ازدواجی رشتے کے بارے میں فرمایا کہ "میں نے کوئی ایسی چیز نکاح کے سوا نہ دیکھی جو دو اجنبی افراد کے درمیان پُرجوش محبت پیدا کردے" (مشکوٰۃ۔ کتاب النکاح۔ فصل ۳۔ بروایت حضرت ابن عباسؓ۔ ماخوذ از ابن ماجہ)۔ مزید یہ کلمات شاید بصیرت افروز ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ سے یہ فرمایا کہ "تم نے کنواری عورت سے کیوں شادی نہ کی کہ تو اس کے ساتھ کھیلتا اور وہ تیرے ساتھ کھیلتی"۔ یعنی نکاح کو سنجیدہ اور ٹھس طرز کا معاملہ ہی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس میں کچھ دلکشی (ROMANCE) کا ہونا بھی ضروری ہے۔

ان سارے اشارات کو پیش نظر رکھ کر ذرا غور سے اس ازدواجی زندگی کو دیکھیے جو نمونہ کے طور پر حضورؐ نے گذاری۔ آپؐ نے ازواجِ مطہرات سے دل لگی بھی کی، ان کو دین کی تعلیم بھی دی، ان کے سامنے قصے بھی بیان کیے، ان کے کاموں میں ذوق وشوق سے حصہ بھی لیا تاکہ ان کا بار کم ہوجائے۔ ان کے ناز بھی برداشت کیے اور ان کی ناپسندیدہ باتوں پر صبر کرکے تلقینِ اصلاح بھی کی۔ خاص طور سے حضرت سیدۃ النساء عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف سے کئی بار ایسی شوخیاں ہوئیں کہ آپ کے شوہر جیسے آدمی سامنے ہوں تو اس سے نتھنے پھول جائیں، مگر حضورؐ ہمیشہ ہنس کر، لطف اندوز ہو کر، کبھی کوئی ایک ہلکا سا اصلاحی اشارہ کرکے دوسری طرف متوجہ ہوگئے۔ کوئی ایک مثال بھی تو بیویوں کے حق میں بدزبانی یا مارپیٹ کی سامنے نہیں آئی۔

حضورؐ نے تو یہ سکھایا کہ ہوسکتا ہے کہ کسی عورت کی ایک ادا تم کو ناپسند ہو مگر پھر کوئی دوسرا پسندیدہ

پہلو سامنے آئے۔ ہر قسم کے احوال و رجحانات کا جائزہ لے کر توازن سے فیصلہ کرنا چاہیے کہ کوئی عورت بہ حیثیت مجموعی قابلِ قدر ہے یا نہیں۔ یہی نہیں، قرآن اور حدیث دونوں میں تاکید کی گئی ہے کہ اگر نوبت جدائی تک بھی پہنچ جائے تو اصول "سراحاً جمیلاً" کا ہونا چاہیے۔ یعنی حُسن و خوبی سے رخصت کرنا۔ یہ ہے گھر کا اسلامی تصور، اسے سامنے رکھ کر شوہر کو بھی اور بیوی کو بھی راہِ عمل متعین کرنی چاہیے۔

۳۔ شوہر کی جانب سے سارا زور لفظ "قوامیت" پر دیا جاتا ہے۔ قوامیت کے لفظ میں اقتدارِ عام کا مفہوم شامل نہیں، یہ ایک انتظامی تدبیر ہے۔ جیسے دو راستہ چلنے والوں میں سے ایک کو امیر اور دو یا دو سے زیادہ نمازیوں میں سے ایک کو امام بنا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح گھر کا نظم و نسق درست رکھنے کے لیے شوہر کو ایک فوقیت دی گئی ہے (وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ) البقرہ۔ ۲۲۸۔ اس درجہ کی وجہ سے کبھی کبھار کوئی حکم دینے کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ مگر مراد یہ نہیں کوئی نظامِ سلطنت چلایا جاتا ہے۔ اب پانی پینے کا حکم ہے، اب چھ گھنٹے تک کھانا نہ کھانے کا حکم ہے، اب اُلٹا لٹک جانے کا حکم ہے، اب دو گھنٹے دھوپ میں کھڑے ہونے کا حکم ہے۔ اب بیمار باپ کی بیمار پرسی کو جانے کی ممانعت ہے۔ گھر نہ ہوا، قید خانہ یا پولیس اسٹیشن ہوا۔

مرد اپنے "درجہ" کی بنیاد پر بعض استحقاقات رکھتے ہیں، لیکن اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ خود اس درجہ کی وجہ سے عاید ہونے والی ذمہ داری کو پورا کریں۔ اس درجہ کی وجہ سے مرد کی ذمہ داری یہ ہے کہ کھانے پینے اور رہنے اور دوا دارو وغیرہ کے انتظامات اپنی آمدنی کے لحاظ سے اور خود اپنے ذوق و مصارف کے لحاظ سے معیاری مہیا کرے۔ بیوی کو رہنے کی ایسی جگہ فراہم کرے خواہ وہ ایک جھونپڑی ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں وہ کسی مداخلت کے بغیر پوری (PRIVACY) کے ساتھ رہ سکے[1]۔ ورنہ نہ تو اُسے آزادی ہی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ وہ جھگڑوں سے بچ سکتی ہے۔ اس کی

[1] حنفی فقہ کی رُو سے خاوند کا فرض ہے کہ وہ عورت کو ایک ایسا مکان فراہم کرے، چاہے غریبی کی وجہ سے وہ ایک ہی کمرے کا ہو، جس کا تالہ اور جس کی کنجی بیوی کی تحویل میں رہے اور اس کی اجازت اور خوشی کے بغیر کوئی اندر داخل نہ ہو۔

جان، اس کے جسم، اس کی عزت، اس کے وقار کا پورا پورا تحفظ کرنا اور دوسرے لوگوں (خصوصاً اپنے اقربا) کی زیادتیوں سے اس کو بچانا شوہر کی ذمہ داری ہے اور خود اپنی دشتوں سے بچانا بھی!

اگر کوئی شوہر بیوی کے حقوق پوری طرح ادا نہیں کرتا اور بیوی کو ایسے حالات میں رکھتا ہے کہ اُسے زبردستی جھگڑوں جھمیلوں میں ملوث بھی کیا جائے اور اس کی توہین و تذلیل بھی ہو تو پھر اپنے "درجۂ قوامیت" کا حوالہ دے کر یہ تقاضا کرنا کہ میرا حکم مانو اور جو کچھ جس طرح میں چاہوں اس طرح کرو، قرینِ انصاف نہیں ہے۔

مزید ستم یہ ہے کہ بیوی کو مار کھدیڑ کر گھر سے نکالا گیا ہو، پھر اس کی اور بچوں کی کسی طرح کی خبر گیری اور نان و نفقہ کی بہم رسانی نہ کی گئی ہو، پھر آدمی یکایک نمودار ہو اور کہے کہ چلو اُٹھو، میرا حکم مانو، (تاکہ چند روز بعد پھر تم کو اسی طرح مار کھدیڑ کر نکالا جا سکے) تو یہ مرد کی طرف سے قوامیت کے اختیار کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ یہ خدا و رسولؐ سے ہیر پھیر ہے۔

ایسے شوہر کی طرف سے بیوی اور اس کے اولیاء کو یقین دہانی کرائی جانی چاہیے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ معاملہ کسی مجلس شرفائے خاندان میں طے ہونا چاہیے۔

یہ واضح رہے کہ بیوی اگر شوہر کے گھر سے خود نہ نکلی ہو، بلکہ اسے زبردستی نکالا گیا ہو تو اس کا گناہ شوہر اور اس کے حامیوں پر ہے۔ اسی طرح خبر گیری نہ کرنے اور نان و نفقہ کا انتظام نہ کرنے کا بھی گناہ ہے۔ اس گناہ پر بیوی سے معافی مانگنی چاہیے اور خدا سے توبہ کرنی چاہیے۔ ورنہ آخرت میں ان زیادتیوں کا حساب دینا ہوگا۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ عقوبت کا کچھ حصہ اسی دنیا میں چکھا دے۔

۴۔ جو لوگ (چاہے وہ خود شوہر یا بیوی یا اُن کے ماں باپ اور بہن بھائی ہوں) میاں بیوی کے تعلقات کے بگاڑنے میں کسی درجے میں بھی حصہ لیں تو وہ مطابق بہ ارشاد قرآنی "ویقطعون ما امر اللہ بہٖ ان یوصل (البقرہ ۔ ۲۷)" خدا کے نزدیک مجرم ہیں اور حدیث میں ایسی شر انگیزیوں کو بہت بڑا شیطانی کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔

علی الاعلان لڑائیاں کر کے، لڑائیوں میں بلاوجہ ملوث کر کے، پسِ پردہ غیبت اور سرگوشیاں اور سازشیں کر کے، خواہ مخواہ کے الزام چھانٹ کر، کسی عورت کو تنگ کرتے کرتے منہ کھولنے پر مجبور کر کے جو

لوگ بھی زوجین میں بے اعتمادی اور نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ وہ اسلام کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہیں۔ اور اس خرابیٔ احوال کے پیدا کرنے میں اگر خود شوہر کی جہالت و حیوانیت کا حصہ زیادہ ہے تو نتائج کا سزاوار وہی ہوگا۔

ساتھ ہی گھروں کی فضا کو بگاڑنے والے زوجین اور ان کے رشتہ داروں کو یہ جاننا چاہیے کہ جہاں کہیں زوجین لڑتے جھگڑتے رہتے ہوں، جہاں کہیں گھروں میں لوگ ایک دوسرے کا فضیحتا کرتے ہوں، جہاں غیبت اور چغلیاں چلتی ہوں، جہاں شوہر لٹھ بازی کرتے ہوں اور بیویوں کو گھروں سے نکال دیتے ہوں، وہاں اولاد کا اخلاقی لحاظ سے ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اور اس کی ذمہ داری عنداللہ ہر اس شخص پر ہوگی جس نے ماحول کو فاسد بنانے میں حصہ لیا۔ بگڑی ہوئی اولاد کے اثرات پیدا ہوتے چلیں گے نسلاً بعد نسل۔

جن لوگوں کے بچے ہو جائیں ان کو خاص طور سے محتاط ہو جانا چاہیے۔

۵— بات مکمل نہ ہوگی، اگر عورتوں کو مارنے کے مسئلے میں ایک ضروری پہلو کو واضح نہ کر دیا جائے۔ عورتوں کو مارنے کا معاملہ کوئی کھیل تماشا نہیں ہے کہ جب جی چاہا مارنے کی کارروائی شروع کر دی۔ وہ کوئی گائے بھینس نہیں ہیں —— بلکہ شریعت میں تو گائے بھینسوں پر بھی ظلم کرنا ناروا ہے اور بلاوجہ تکلیف دینے کا بدلہ قیامت میں دینا ہوگا —— ! آپ نے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ جاؤ اس درخت پر چڑھ کر اس کے ٹہنے کاٹ دو، حالانکہ جس درخت پر چڑھنے کی ہمت ہی نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ، برستے اولوں میں جا کر چار گھنٹے کھڑی رہو، آپ نے کہا کہ رات کو میرے دوست اور ان کی بیویاں مہمان آئیں گی، ان کے لیے اعلیٰ کھانے پکا رکھنا۔ دریں حالیکہ اس کے طلب کرنے کے باوجود آپ نہ کوئی پیسہ دے کے گئے اور نہ کسی سے قرض لینے کی اجازت دی۔ اِدھر بچہ سیڑھیوں سے شام کو گرا اور آپ کی بیوی اسے ہسپتال لے گئی۔ آپ دوستوں سمیت آ گئے اور بیوی کی واپسی پر اسے توہ ڈالا۔ ذرا پانی دینے میں دیر ہو گئی یا چائے دم کرنا مجبول گئی تو آپ نے لاٹھی اٹھا لی کہ حکم نہیں مانا۔ آخر حکم دینا کیا ضرور، ویسے ہی بات کہی جا سکتی تھی، اور حکم دینا تو سلیقے اور طریقے سے دیا جا سکتا ہے اور بیوی سے کوتاہی ہو جائے تو عذر کا لحاظ کیا جا سکتا ہے۔ سارے ازدواج کے معنی ایک حکم دینا ہی تو نہیں —— خصوصاً ”اندھا حکم“ دینا، بغیر سوچے سمجھے۔

فی الحقیقت اس معاملے کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ وہ ایک حالت ہے، حالت "نشوز" کی جسے سرکشی کہہ سکتے ہیں، عورت جب اسے اختیار کرے تو پھر سختی کی گنجائش ہے۔ "نشوز" ایک مستقل رویہ ہے، ذرا ذرا سی جزوی بات پر نشوز کا انطباق نہیں کیا جا سکتا۔

اصولاً عورت کا حقیقی نشوز اور اس کی سب سے بڑی شکل یہ ہے کہ وہ ازدواجی تعلقات کی پاکیزگی کو خراب کرے اور حفظِ عصمت میں شوہر سے تعاون کرنے سے انکار کر دے۔ یہی وہ چیز ہے جو اس کی اہم ترین محرک ہے کہ عورت پر سختی کی جائے۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں عورتوں کے متعلق جو کچھ حضورؐ نے فرمایا، اس میں ایک جملہ یہ ہے:

"اور ان پر تمہارا حق یہ آتا ہے کہ وہ تمہاری خوابگاہوں میں کسی ایسے شخص کو داخل نہ ہونے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو۔"

"پھر اگر وہ ایسا کریں تو انہیں مار سکتے ہو، ایسی مار جو شدید نہ ہو۔"[1]

(مشکوٰۃ۔ خطبہ حجۃ الوداع - روایت جابر بن عبداللہ)

مراد یہ کہ عورت کی طرف سے مرد کے لیے ازدواجی اور جنسی زندگی میں پوری وفاداری چاہیے۔ وہ کسی ناپسندیدہ شخص کو گھر میں نہ آنے دیں، کسی غلط آدمی کے پاس نہ جائیں، کسی نامحرم سے میل جول نہ رکھیں،

---

[1] عورتوں کے متعلق ابتدائے کلام یوں ہوئی۔ فاتقوا اللہ فی النساء (عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو، یعنی زیادتی نہ کرو) فَاِنَّکُمْ اَخَذْتُمُوْهُنَّ بِاَمَانِ اللّٰهِ (پس تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے۔ یعنی تم ان کے مالک نہیں ہو)۔ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِکَلِمَةِ اللّٰهِ (تم نے ان کے جسموں کو اللہ کے قانون کے تحت اپنے لیے حلال کیا ہے۔ یعنی شریعت اور قانون تمہارا نہیں خدا کا ہے)۔ اس سارے سلسلۂ کلام سے صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ عورتوں کو لوگوں کی زیادتیوں سے بچانا چاہتے تھے۔ مردوں کا سب سے بڑا حق واضح کر دیا جس کو ضائع کرنے پر گرفت کی جا سکتی ہے اور آخر میں مردوں کو بھی بتایا کہ "وَلَهُنَّ عَلَیْکُمْ رِزْقُهُنَّ وَکِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" (ان کا تم پر نان و نفقہ کا حق ہے، معروف طریقے سے۔

کسی سے خط و کتابت نہ کریں۔ وہ اپنی عصمت کا سختی سے تحفظ کریں۔ یہ وہ اساسی ذمہ داری ہے کہ اگر کوئی عورت اس کو پورا نہیں کرتی تو شوہر اپنے آخری اختیار کو استعمال کر سکتا ہے۔ گھروں کے اندر ان کو اپنی خواب گاہوں سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

دوسری بڑی چیز یہ ہے کہ چونکہ گھر کی معاشی کفالت شوہر کے ذمے ہے، اس لیے آمدنی کے مطابق آمد و صرف کا جو نظام باہمی مشاورت سے طے پائے، خاتونِ خانہ کو چاہیے کہ وہ اس کی پاسداری کرے۔

تیسری اہم چیز کسی گھر کی یہ پالیسی ہے کہ کس سے تعلقات رکھنے ہیں۔ کس سے نہیں، کیسے لوگوں سے رشتوں کا لین دین ہوگا اور کیسے لوگوں سے نہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور کس طرح ہوگا۔

چوتھی چیز جو آخر میں مذکور ہونے کے باوجود بہت اہم ہے یہ ہے کہ میاں بیوی کو اپنے گھر میں دینِ برحق کے کن اصولوں، مقاصد، تقاضوں اور عبادات و اخلاق کو مقدم رکھنا ہوگا۔ اور کن غلط نظریات کن بُری رسموں اور کن بداخلاقیوں سے اپنا اور بچوں کا تحفظ کرنا ہوگا۔

اب اگر کوئی عورت ازدواجی وفاداری کے تحفظ کے بعد گھر کی زندگی کے ان نہایت ہی اہم اور بنیادی پہلوؤں کے متعلق مسلسل اور مستقل بغاوت یا سرکشی کا رویہ اختیار کرتی ہے تو بھی ایک طرح کا "نشوز" ہے اور اس پر جسمانی سزا دی جا سکتی ہے۔

لیکن ان اصول و حدود سے ہٹ کر عام قسم کی معمولی چیزوں کو مارنے کے بہانے بنانا اور زبان سے نکلنے والی ہر بات کو حکم بنا دینا اور ہر فضول اور لایعنی حکم کو منوانے کے لیے اختیار ظاہر کرنا ازروئے شریعت (اس کے وسیع اصولی تصورات کے ساتھ) درست نہیں ہے۔

میں نے اپنے شعور کے مطابق اسلام کے عائلی نظام کے صحیح ڈھانچے کو اس کی اصل روح کے ساتھ عرض کر دیا ہے، اس کا زیادہ تر فائدہ تو یہی ہے کہ آپ کو حقائق کا علم ہو جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی ایسی اچھی صورت پیدا ہو جائے کہ کسی مجلسِ مفاہمت کے ذریعے اس کے بعض اچھے نکات فریقِ ثانی کے علم میں بھی آ جائیں۔

میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ کے انفرادی حالات کیسے ہیں اور آپ ان کی وجہ سے کس درجہ مجبور ہوں گی، مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر سچے اسلامی رجحانات کی خواتین اپنے آپ کو منظم کر کے جاہلی احوال

کے خلاف معرکہ آرا نہ ہوں گی تو مستقبل کی ساری قوت دین سے سرکشی کرنے والی ماڈرن عورت کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ عورتیں خود مل کر سوچیں کہ وہ مردوں اور عورتوں کی صف آرائی کے بجائے اگر محض اپنے صحیح شرعی حقوق معاشرے سے حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا چاہیں تو وہ کیا کیا تدابیر اختیار کر سکتی ہیں اور کس طرح وجۂ اِفساد بننے کے بجائے اصلاح و تعمیر کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

یہ معاملہ بھی ہر عورت کے انفرادی حالات پر منحصر ہے کہ اگر اس کو ظلم کا نشانہ بنایا جائے یا اس کی حق مارِی کی جائے، اس سے انسانی طرزِ معاملہ کرنے کے بجائے جانوروں کے انداز سے معاملہ کیا جائے، اس سے کوئی بات منوانے کے لیے استدلال کے بجائے لٹھ استعمال کیا جائے تو آیا اسے ساری جبرہ دستیوں کو چپ چاپ عمر بھر سہتے رہنا چاہیے یا ظلم کے خلاف احتجاج کی آواز اُٹھانی چاہیے اور جبر کی قوت کا زور استدلال سے توڑ دینا چاہیے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ گھریلو امن کی خاطر اگرچہ صبر و رضا سے ظلم کے کسی دور کو چپ چاپ گزار دینا بڑی قابلِ قدر قربانی ہے، مگر چونکہ عورت کی اس قربانی سے مرد نے مسلسل ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے اور اُٹھا رہا ہے، لہٰذا سکڑی سہمی اور مجروح عورت کو ایک نہ ایک دن شوہر کے غیر انسانی رویے کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا ہوگا — صرف اس لیے کہ اگر مسئلے کا حل اسلامی اصولوں کی بنا پر نہ نکلا تو پھر ساری بازی لادینیت پسند عورت کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔

جہاں تک آپ کے اپنے متعلق اس متعین سوال کا تعلق ہے کہ "کیا میں پہلے سے بدتر حالات کا امکان ہونے کے باوجود واپس چلی جاؤں یا انکار کر دوں"۔

اس معاشرے کے عملی حالات کے لحاظ سے مجھے یہ اندازہ ہے کہ گھر سے اُکھڑی ہوئی خاتون کے لیے حالات اور بھی کٹھن ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بھائی اور ان کی بیویاں تک حسنِ سلوک کی راہ پر نہیں رہ سکتیں۔ ان حالات کی سخت تر آزمائش کے لحاظ سے اپنے بارے میں حتمی فیصلہ آپ سارے معاشی و معاشرتی امکانات کو سامنے رکھ کر خود کریں۔ یہ ذمہ داری کسی مشورہ دینے والے خیر خواہ پر مت ڈالیں۔

پس نوشت —

اس موقع پر میں تحریکِ اسلامی کی خواتین سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وہ معاشرے

کے ان کو بتائیں اور شرم ناک حالات کو جانیں، سمجھیں اور ان کے حل کے لیے راہیں نکالیں۔ وہ جن لاکھوں عورتوں کو اپنے دائرے میں رکھ کر سوچتی ہیں، ان میں سے بہت سی تعداد جانوروں کی زندگی گزار رہی ہے، بلکہ زندگی کو سزا کے طور پر بھگت رہی ہے۔ ایک طرف مظلوم عورتیں اسلامی عقیدوں، عبادتوں اور پردہ داری اور اندھی اطاعتِ شوہر کو لے کر نہایت ذلیل حالات کے پُل صراط سے گذر رہی ہیں؛ ان میں سے بہت سی اس پُل پر سے دائیں طرف اور بائیں طرف بچوں کو اٹھائے ہوئے اضطراب اور دکھ کی آگ میں گر رہی ہیں، بلکہ خودکشی بھی کرتی ہیں ——— اور دوسری طرف آپ ان کا حوالہ دے کر ماڈرن عورتوں کے لشکر کا سامنا یہ کہہ کر کرتی ہیں کہ چاردیواری میں ہماری بڑی قوت محاذ بنائے بیٹھی ہے اور بعض کو باہر آپ چادروں میں دیکھتی ہیں۔ اس حساب سے ہم بڑی قوت ہیں۔ بڑی قوت تو ہوئی، لیکن اس قوت کے جس بڑے حصے کی انا کو سیکڑوں چاردیواریوں کے پیچھے کھڑا کیا جا رہا ہے، وہ آخر کام آنے کے لحاظ سے کتنی بڑی ثابت ہوگی۔

اسلام کو چاہنے والی خواتین نے کچھ دائروں میں اسلام کی دعوت پھیلائی۔ بڑا اچھا کام کیا۔

انھوں نے انتخابات میں تھوڑے بہت ووٹ اچھے افراد کے حق میں استعمال کرائے۔ یہ بھی اچھا کیا۔

انھوں نے ماڈرن خواتین کے ثقافتی چونچلوں، لادینیت پسندانہ سلوگنوں اور رندی و ہوسنا کی کے خلاف پروپیگنڈے سے بھی اور مظاہروں سے بھی آواز اٹھائی۔ یہ بھی خوب!

مگر انھوں نے اسلامی پالیسی کے ساتھ کام کرتے ہوئے پرانی جاہلیت کی چکی میں پسنے والی بہت سی خدا پرست یا کم سے کم حیادار و شریف عورتوں کے لیے کچھ نہ کیا۔ وہ اگر ان کے لیے جگہ جگہ ادارے کھول لیتیں، مثلاً درسِ قرآن و حدیث کے ادارے، تعلیم بالغان کے زنانہ ادارے، زنانہ دستکاریوں (کشیدہ کاری، کپڑوں کی کٹائی، سلائی وغیرہ) کے ادارے، زچہ و بچہ کی بہبود کے ادارے، خدمتِ خلق کے چھوٹے چھوٹے محلے دار ادارے ——— اور پھر ان میں ہر طرح کی عورتیں آتیں اور ان کے متعلقین آتے اور مظلوم عورتوں کے حالات آپ کو معلوم ہوتے، آپ مظلوموں کو کچھ تلقین کرسکتیں۔ ان کے سلسلے میں خاص خاص ملاقاتیں اور گفتگوئیں کرسکتیں۔ کسی کو مالی مدد کی ضرورت ہوتی تو بہم پہنچاتیں، کسی کو دوا کی ضرورت ہوتی تو فراہم کرتیں، بعض کے شوہروں

کو تبلیغی قسم کے خطوط میں قرآن و حدیث کے احکام اور اخلاقی تلقینات لکھ بھیجتیں، کسی عورت کو خلع لینے کی ناگزیر ضرورت ہوتی تو اُسے معلومات اور عملی مدد بہم پہنچاتیں۔ عورتوں کی مصیبت زدگی کے متعلق مضامین لکھ کر پبلک میں یہ ثابت کرتیں کہ آپ ان مظالم کے بھی سخت خلاف ہیں جو پردہ دار یا غریب گھروں میں اسلام کے نام پر ہو رہے ہیں۔ آپ ایسے معاملات میں قرارداد یں پاس کرتیں، ان کے حل کے لیے بعض ثانوی تدبیریں فقہا کی مدد سے معلوم کر کے کچھ قانونی خاکے پارلیمنٹ میں بھجواتیں، یہاں تک کہ یہ معروف ہو جاتے کہ پرانی مظلوم عورتوں اور بدحال گھرانوں کا معاملہ بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

مجھے اخبارات کے ذریعے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ مختلف شہروں اور علاقوں میں تعلیم یافتہ عورتیں اور لڑکیاں مل کر عورتوں کے لیے خدمتِ خلق کے طرح طرح کے کام کر رہی ہیں۔ مثلاً لاہور کا ایک گروپ ایک ہسپتال کے تعاون سے وین ساتھ لے کر مضافات میں علاج کے لیے جاتا ہے۔ اور پھر عورتوں میں بیٹھ کر اپنے مطلب کی باتیں بھی پھیلاتا ہے۔ ہمارے قریب کے علاقے میں چند سادہ سی لڑکیوں نے معمولی مالیات کے ساتھ کام شروع کیا۔ کچھ چندے جمع کیے۔ اور پھر ایک "آئی کیمپ" (غالباً عورتوں کے لیے) لگوا دیا۔ اس کیمپ کے لیے انھوں نے جن ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں ان میں سے اپنے ایک نیک نہاد...... قومی دوست بھی شامل ہیں۔ یہ روئیداد پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ افسوس ہے کہ ہمارے پاس ایسی چند لڑکیاں کہیں نہیں ہیں۔ کیمپ میں آنے والی بے شمار مریض اور نیازمند عورتوں سے آپ کو کیا کیا سٹوریاں ملتیں، کن کن حقائق کا علم ہوتا اور کام کے کیا کیا راستے کھلتے۔

مؤثر کام کے وسیع راستے اگر بنائے گئے ہوتے اور آپ تعلیم، صحت اور نیکی کا پیغام لے کے نکل کھڑی ہوتیں اور عورتوں کی دردناک کہانیاں (کم سے کم ان کے کتھارسس کے لیے) سنتیں تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ تحریکِ اسلامی کے لیے کتنی وادیاں منتظر ہیں۔

ممکن ہے کہ میرا یہ نقشہ غلط ہو۔ آپ زیادہ صحیح نقشہ بنائیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کام ایک ایسے بڑے میدان کو سنبھال لیں جو اگر کسی تخریبی قوت کے ہاتھ میں چلا گیا تو پھر کوئی تلافی نہ ہو سکے گی۔ پرانی عورت کی مظلومیت کی چیخیں کام کرنے والوں کے لیے ایک بلاوا ہیں۔ کون انہیں سنتا سمجھتا ہے

اور کون نہیں۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔

پرانی نیک عورت کو نئی نیک اور تعلیم یافتہ عورت ہی صحیح کام دے سکتی ہے ورنہ اگر وہ جدید عنصر کے ہتھے چڑھ گئی تو پھر نہ پرانا معاشرہ ہمارا رہے گا، نہ نیا۔ دونوں جگہ جنگ ہی جنگ رہ جائے گی۔

(بقیہ صفحہ ۲۷)

مداخلت ہو، یا مغرب کی لادینی ساخت کی مروجہ جمہوریت کو فی نفسہٖ اوّلیت دینے لگے ہیں اور دینی پوائنٹ اتحادی خاکوں اور گفتگوؤں سے تقریباً خارج ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی سیاست و جمہوریت اگر دینی اصلاحات کے بغیر فی نفسہٖ مقصود بن جائے اور اسے چلایا جائے تو نتیجے میں بدترین آمریت و فسطائیت کے علاوہ پُرزور لادینیت بھی نمودار ہو سکتی ہے۔

بنابریں یہ پوائنٹ بہت ہی اہم تھا کہ واضح کیا جائے کہ کن موسسات پر قومی اتحاد قائم ہوا تھا۔

نوٹ: یہ دستاویزی کتاب فاضل مؤلف کی طرف سے راقم کو ہدیہ کی گئی جس کے لیے میں بہت شکر گزار ہوں۔

مطبوعات

قرآن — معجزہ جاودان | **مصنف**: احمد دیدات، مترجم: میجر عنایت اللہ، ناشر: پروفیسر مسز عنایت اللہ پرنسپل گورنمنٹ گرلز کالج، چونیاں ضلع لاہور۔ ملنے کا پتہ: دار المطالعہ جماعت اسلامی چونیاں ضلع قصور۔

بہائیوں نے عدد ۱۹ کے گرد ایک پُر اسرار مذہب بُن لیا ہے۔ ان کا سال ۱۹ مہینے کا اور ہر مہینہ ۱۹ دن کا ہوتا ہے۔ (یہ انکشاف نزولِ قرآن کے ۱۴ سو سال بعد ہوا)۔ (ص ۱۱۷) ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر راشد خلیفہ نے مقطعات یا قرآنی مخفف دستخطوں (؟) کا ایک دلچسپ مطالعہ کیا" (ص ۹۶)۔ پھر عدد ۱۹ اور قرآن کے الفاظ اور سورتوں کی گنتی سے حسابی عجائبات (جنہیں معجزہ کہا گیا ہے) سامنے لا کر حیران کیا گیا ہے۔

قارئین شاید بھولے نہ ہوں کہ راشد خلیفہ کے انکشافات کی خوب اشاعت ہوئی تھی، پھر اس پر یہاں کے علما کے علاوہ سعودی عرب سے تنقیدی بحثیں اُٹھیں اور معاملہ ختم ہو گیا۔ مگر اس دورِ طباعت کا فیض ہے کہ وہی چیز ایک اور طرف سے چھپ کر آ گئی۔

میں کسی لمبی بحث میں پڑے بغیر چند اُمور پر بات کرتا ہوں۔

۱۔ کیا اعداد ابجد کسی نبی پر آمدہ وحی سے متعین ہوئے ہیں کہ اب خدا کی کتاب کو ان کے ذریعے جانچا جائے؟

۲۔ جہنم سے متعلق ۱۹ کا عدد تو سامنے آ گیا، لیکن خدا کا عرش اُٹھانے والے آٹھ فرشتوں کے عدد پہ کوئی کاوش کیوں نہ کی گئی؟ زمین و آسمان کو ستہ ایام میں بنایا گیا، اس ۶ کے عدد میں بھی کوئی خصوصیت نہیں اور جو دوسرے اعداد قرآن میں ہیں، ان سب کو بیان نہیں کیا جا رہا۔ ۱۹ کی خصوصیت کیوں؟

۳۔ علیہا تسعۃ عشر کا ترجمہ کیا گیا ہے: "اس پر انیس ہیں"۔ (قرآن ۷۴: ۳۰)

اور تشریح کی گئی ہے کہ "دوسرے الفاظ میں اگر کوئی شخص پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ جھوٹا الزام تراشے کہ وہ اللہ کی کتاب کے مصنف ہیں تو وہ شخص دوسری چیزوں کے علاوہ اپنے اوپر انیس پائے گا۔ اس کو انیس کے ساتھ حساب چکانا ہوگا" (ص ۔ ۴۰) یعنی آیت میں علیھا کی ضمیر مؤنث کی ہے اور یہاں مجرم آدمی کا ذکر بطور مذکر کیا جا رہا ہے۔ اور یہی صورت دوسرے صفحات پر بھی ہے۔ قرآن میں بات سیدھی سی ہے کہ جہنم کا ذکر کر کے فرمایا اس پر ۱۹ (مقرر) ہیں، یعنی فرشتے (یہاں فرشتوں کے تصور پر اجماع ہے) آپ اسے پر اسرار معجزہ قرار دے رہے ہیں۔ آخر خدا کے پیغمبر نے قرآن کی صداقت کی اور دلیلیں تو بہت دیں، ایک یہ "دو اور دو چار" جیسی دلیل نہ دی اور نہ اللہ نے بتائی۔

۴۔ کتاب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس ریاضیاتی معجزے کی وجہ سے قرآن کا مصنف کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔ مگر اس عددی انکشاف سے پہلے بھی کوئی انسان مصنفِ قرآن نہ ہو سکتا تھا۔ قرآن میں جو چیلنج مخالفین کو دیا گیا ہے کہ اس جیسی ایک سورت یا ایک آیت ہی بنا لاؤ، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر سورت اور ہر آیت کے جدا جدا اعداد ۱۹ ہیں؟ نیز کیا قرآن کا اعجاز صرف یہ عددی اعجاز ہے۔ یا یہ کہ اس کا طرزِ کلام، اس کے مخصوص مباحث، اس کی اثر اندازی، اس کی ادبیت، اور اس کی دوسری خصوصیات کی وجہ سے وہ ہمہ تن ایک معجزہ ہے اور کوئی انسانی کلام اس کے معیار کو نہیں پا سکتا، چنانچہ عرب فصحا نے اس چیلنج کا کوئی جواب نہیں دیا۔

۵۔ نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ سے دلالت کی گئی ہے کہ اس نظامِ اعداد کے ذریعے اللہ نے قرآن کی حفاظت کا انتظام کیا ہے۔ حالانکہ بیک وقت کثیر التعداد حفاظ اور قاریوں کا تیار ہو جانا۔ نمازوں میں بار بار قرآن کے مختلف حصوں کا جماعت کے سامنے پڑھا جانا، گھر گھر میں تلاوت ہونا۔ وحی کی تحریری نقول کا ساتھ کے ساتھ تیار ہونا، قرآنی حقائق پر دروس اور مواعظ اور مباحث کا جاری رہنا، نیز عملاً احکام قرآنی کے لفظ لفظ پر معاشرے کے تمام افراد کا کاربند ہونا، حاکموں اور قاضیوں کا اس کے مطابق فیصلے کرنا اور احادیث کا قرآنی مطالب و حقائق کی تفصیل بیان کرنا —— کیا یہ سب نظامِ حفاظت نہیں ہے؟

۶۔ کیا وجہ ہے کہ نہ تو جدا جدا حروفِ مقطعات کے مجموعوں کے اعداد لازماً ۱۹ ہیں، نہ سب کی مجموعی تعداد ۲۸ کو ۱۹ سے تقسیم کیا جا سکتا ہے، نہ سورتوں کا معاملہ اس طرح، بلکہ جہاں ضرورت پڑتی

ہے وہاں کچھ ادھر سے لے کر اُدھر ملا لیا جاتا ہے اور بات بن جاتی ہے۔ اس طرح کے عجوبے اور بھی ہیں۔ مثلاً ایک وہ مشہور ہے کہ جس میں کوئی بھی بڑے سے بڑا ہندسہ لے کر آپ مخصوص حسابی عمل کریں تو جواب ۹۲ آئے گا۔ (اعدادِ محمدؐ)

۷۔ اس پوری کتاب کو پڑھتے ہوئے آدمی عددی عجائبات کی مجہول بھلیاں سے گزرتا ہے تو کوئی ایسی کیفیت طاری نہیں ہوتی جو اس میں اخلاص، رجوع الی اللہ، توبہ و انابت اور رقت و عاجزی کے انداز پیدا کرے۔ قرآن کے حروف کی گنتی، اس کے لفظوں کا شمار، اس کی کششوں اور مدّوں کا حساب فتحہ، کسرہ اور ضمہ کی تعدادیں، اب اگر ان کاوشوں میں لوگ لگ جائیں تو پھر تحریکِ اسلامی کا چلنا اور انقلابِ اسلامی کا نمودار ہونا تو ممکن ہی نہ رہے گا۔ بس نئی قسم کے تصوف کے گنتی خانے کھل جائیں گے جو ۱۹ دانوں کی تسبیح گھمایا کریں گے۔

آخر میں ہماری گذارش یہ ہے کہ ۱۹ کے اس جدید تحقیق سے پہلے بھی ہمارا قرآن کی صداقت پر مکمل ایمان تھا اور اب بھی ہے، اصل کام یہ ہے کہ قرآن پر عمل کیا جائے اور اسی عمل کی جھلکیاں دوسروں کو اسلام کے قریب لائیں گی۔ ابجدی اعداد کے کھیل دین کا کوئی حصہ و شعبہ نہیں ہیں۔

اسلام اور جدید دور کے مسائل | مولانا محمد تقی امینی۔ ناشر: (ملنے کا پتہ) قدیمی کتب خانہ، مقابل آرام باغ، کراچی ۱۔ مجلد صفحات ۲۴۲ قیمت: /۶۰ روپے

اس کتاب کو میں نے ذوق و شوق سے پڑھا۔ اس کی اہمیت ایسی ہے کہ بڑی طویل گفتگو کی ضرورت ہے لیکن رسالے کی وادی کی تنگ دامانیاں چونکہ اپنے قلم کی جولانیوں کی تاب نہیں رکھتیں، لہٰذا اجمال ایک مجبوری ہے۔ میں مولانا تقی امینی کی کتابیں پہلے بھی شوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ ان کا ایک خاص مقام علماء و مفکرین میں اس بنا پر ہے کہ انہوں نے دورِ جدید کے پیش آمدہ مسائل کے چیلنج کو خوب سمجھا ہے اور اشکالات کے حل کے لیے اجتہاد کا راستہ واضح کیا ہے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے کہ اجتہاد کی بحثوں اور اس کے طرح طرح کے مفہوموں سے سابقہ رہا ہے اور قدیم طبقوں نے انسدادِ اجتہاد اور جدید طبقوں نے اجتہاد کے نام سے نصوص اور تمام اجماعی سرمایہ قانونیاتِ سلف پر بلڈوزر پھیر کر لادینی مغربیت کے افکار و اطوار کو دین قرار دینے کی فکر کی۔

ان دو انتہاؤں کے درمیان اور بہت سے اجتہادی نظریے سامنے آئے، کسی کا جھکاؤ اُدھر، کسی کا اِدھر۔ مگر وہ چند اہلِ علم جو ایسی بحثوں میں کلام کا استحقاق بھی رکھتے ہیں اور جنہوں نے اجتہاد کی ترازو کے میزان کو برابر کر کے دکھایا ان میں مولانا تقی عثمانی کا ایک مقام ہے۔ وہ نہ نصوص اور کلیات کی حد پھاندتے ہیں نہ معمولی فقہی جزئیات کو دانتوں سے پکڑتے ہیں۔ نہایت مناسب جادۂ اعتدال انہوں نے تلاش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مذہبی قانون کی بنیاد ہی عظمت و تقدس پر ہے"...... "اس بنا پر جدید تدوین کی کوئی ایسی آواز قابلِ قبول نہ ہو گی جس سے ان دونوں پر کسی طرح زد پڑنے کا اندیشہ ہو، یا قانون کی تبدیلی کی ذہنیت عام ہونے کا خطرہ ہو" (ص ۵۰)

ایک گروہ جس سے یہ خطرہ ہے، اس کے متعلق چند الفاظ:-

"دراصل یہ لوگ اسلام کا ایک جدید ایڈیشن تیار کرنا چاہتے ہیں، جس کی تقریباً ہر چیز باہر سے درآمد کی گئی ہو"۔ (ص ۷۶)

کتاب کا ایک حصہ جدید مسائل پر بحث اور ان کے بارے میں اجتہادی نکات پر مشتمل ہے۔ ان میں بعض چیزیں محلِ نظر ہیں، بعض کی پوری حقیقت واضح نہیں ہو سکی، متعدد پہلو چھوٹ گئے ہیں اور بعض کا معاملہ گویا سوال ہی کا سا ہے۔ محلِ نظر ہونے سے مراد یہ ہے کہ بغیر کسی جذباتی ہیجان کے ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ مثلاً "تعدد ازدواج کی قرآنی اجازت پر وقت کی شرعی حکومت پابندیاں لگا سکتی ہے"۔ (ص-۹۸) یا "ذرائع پیداوار تین حصوں میں تقسیم ہوں گے"۔ (۱) اجتماعی ملکیت میں۔ (۲) بتدریج اجتماعی ملکیت میں لیے جانے والے۔ (۳) انفرادی ملکیت میں۔ (ص-۱۶۸) سٹے اور تمسکات اور بیمہ کی بحثیں بھی بہت طویل ہیں اور خلا بھی رکھتی ہیں۔ بیمہ کے سلسلے میں یہ فقرہ کہ زندگی کا بیمہ پس انداز کی ترغیب اور پس ماندگان کو مالی پریشانی سے بچانے کے لیے ہوتا ہے"۔ (ص-۱۸۲) حالانکہ بخلاف اس کے سرمایہ دار طبقہ یا بنک بیمہ کی مختلف اسکیموں کا ذریعہ نچلے طبقوں کی محدود آمدنیوں سے چھوٹی بچتیں نچوڑ کر بڑا سرمایہ بناتا ہے اور اس کے بھاری منافعوں کا ایک جزو قلیل بیمہ داروں کی طرف منتقل کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان اداروں کا مطالعہ زیادہ گہرائی میں جا کر کرنا چاہیے اور سرسری طور پر احکامِ شریعت چسپاں نہیں کر دینے چاہییں۔

حرم سے حرم تک | پاکستان اسٹیٹ آئل ریویو کا خصوصی حج نمبر۔ مرتبہ: شاہ مصباح الدین شکیل۔
ناشر: پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ، داؤد سنز، مولوی تمیز الدین خاں روڈ، کراچی پاکستان۔

ہماری قومی آئیل کمپنی کے کارپردازوں کی ہمارے دل میں بڑی قدر ہے کہ ان کے اہتمام سے پہلے سیرتِ احمد مجتبیٰ کی جلد اول شائع ہوئی جو ظہور قدسی سے مسجدِ قبا تک کے دور کو محیط ہے۔ شاہ مصباح الدین شکیل نے محبتِ رسول اور اعلیٰ ذوقِ تصنیف اور دلنشیں اُردو زبان سے خوب کام لیا اور پھر حسنِ طباعت کے کیا کہنے۔ اس سلسلے میں سیرت پر بہت لٹریچر کمپنی نے مفت تقسیم کیا۔

اب اسی کمپنی کی طرف سے اس کے آرگن کا خصوصی حج نمبر "حرم سے حرم تک" کے عنوان سے سامنے آیا ہے جو شاہ مصباح الدین ہی کے ذوق ترتیب و تدوین کا آئینہ دار ہے اور جس کا پیرایۂ آغاز ایک مختصر مگر جامع پیش لفظ جناب میاں محمد فرید منیجنگ ڈائریکٹر پاکستان اسٹیٹ کمپنی کے قلم سے ہے۔ اس عبارت کی اگر تلخیص دے دی جائے تو خصوصی نمبر کی پوری جھلک سامنے آجائے۔

حرم سے حرم تک کے پہلے حصے میں شاہ مصباح الدین شکیل صاحب نے حرم کی پوری تاریخ اور اس کی عمارت کی تفصیلات اور خصوصاً غلاف کی تاریخ بیان کی ہے۔ حافظ محمد یونس صاحب نے حاجیوں کو حج کے متعلق مشورے دیئے ہیں۔ مناسکِ حج کے متعلق اصطلاحی الفاظ کی تشریح مفتی سعید احمد صاحب نے بہت خوبی سے کی ہے۔ حج کے احکام شاہ بلیغ الدین صاحب نے تحریر فرمائے ہیں اور ضروریاتِ حج کو واضح کیا ہے

دوسرے حصے میں حکیم ناصر خسرو، ابن بطوطہ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، قاضی سلمان منصور پوری، مولانا عبدالماجد دریا بادی، سید ابوالحسن ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، جناب شورش کاشمیری، جناب ممتاز مفتی، جناب سلطان رفیع اور چند اور شخصیتوں کے سفرنامہ ہائے حج ہیں۔ جن سے نہ صرف حج کے متعلق رہنمائی ملتی ہے، بلکہ حاضریٔ حرم کی راہ کی مشکلات، ان مشکلات کو عبور کرنے کے لیے بہترین جذبات اور اذکار کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

حرم سے حرم تک کو حسبِ ضرورت تصاویر اور نقشوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔

ہم سچے دل سے اپنی قومی آئیل کمپنی کا یہ علمی و دینی تحفہ بھی قبول کرتے ہیں جو صرف تیل ہی سے کام نہیں رکھتی بلکہ ایمان اور نیکی کے چراغ بھی جلاتی رہتی ہے۔

نونہال ۔ خاص نمبر صدر مجلس ادارت : حکیم محمد سعید صاحب و مدیر اعلیٰ مسعود احمد برکاتی ۔
پتہ : ہمدرد نونہال ، ہمدرد ڈاک خانہ ، ناظم آباد ، کراچی ۱۸۰۰ ۔ صفحات : ۳۰۴ ، رنگین ٹائیٹل ،
قیمت خاص نمبر ۱۰/- روپے ۔ عام شمارہ : ۵/- روپے ، سالانہ ۵۵/- روپے

محترم حکیم محمد سعید صاحب کے مختلف کاموں کو اگر مجسم و منجمد کر کے شیشے کی الماریوں میں سجا دیا جائے کہ ایک عظیم الشان عجائب گھر وجود میں آجائے گا ۔ ان کے درخت خدمات کی ایک دلکش شاخ بچوں کا رسالہ نونہال ہے ۔ بچوں کو آج اچھی تحریریں آسان زبان اور دلچسپ انداز میں پڑھنے کی ضرورت پہلے سے کئی گنا زیادہ ہے ۔ آج کل والدین کو تو تمدنِ جدید اور معاشی مسائل گھروں میں ٹکنے ہی نہیں دیتا ۔ وہ تھکے تھکائے گھر آتے ہیں تو یہاں کے رکے ہوئے کام اور ضرورتِ آرام کا دو طرفہ دباؤ ! بچوں کو کون وقت دے کر زندگی اور دین اور اخلاق اور سائنس کے مسائل انہیں سمجھائے ۔ جو بچوں کا کچھ حق ادا کرتے بھی ہیں وہ آج کی وسیع ضروریات اور مسائل کے لحاظ سے آٹے میں نمک کی مثال ہیں ۔ بچوں کی زندگیوں میں یہ خلا اگر پر نہ کیا جائے تو زندگیاں آوارہ و بے مقصد ہو جائیں گی یا اسے غلط موادِ مطالعہ و تفریح سے پُر کیا جائے تو افکار و گفتار اور کردار میں تباہی آجائے گی ۔ اس آفت کے کچھ نہ کچھ اثرات دیکھے جا سکتے ہیں ۔

حکیم صاحب اور بعض دوسرے حضرات جو بچوں کے لیے اچھی ذہنی غذا کی فراہمی کا اہتمام کرتے ہیں وہ بہت بڑی دینی اور قومی خدمت انجام دیتے ہیں ۔ نونہال میں بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر تفریحی تحریریں ، جدید ایجادات کی معلومات ، سبق آموز کہانیاں ، حضور اکرمؐ کی سیرت کی جھلکیاں ، صحت و تندرستی سے متعلق رہنمائی ، انسائیکلو پیڈیا کے عنوان سے سوالوں کے معلومات افزا جواب ، معلوماتِ عامہ ، مخلوقِ خداوندی کے عجائبات ، لطائف ، پہیلیاں ، جغرافیہ ، نظمیں ، سائنسی مشغلے ، قلمی دوستی وغیرہ قسم کا مواد جمع ہے ۔ روبوٹ کی جدید ترین باتیں ہیں ، گلیور اور بونوں کی داستان درج ہے ۔ آخر میں مشکل الفاظ کے معانی ہیں ۔

ابن انشاء مرحوم ، شان الحق حقی ، میرزا ادیب ، پطرس بخاری ، فیض لدھیانوی ، علی ناصر زیدی اور دوسرے لکھنے والوں کے اور ارکانِ ادارہ کے خامہ ہائے گل افشاں نے خاص نمبر میں پھول ہی پھول بکھیر دیئے ہیں ۔

اقرار کرتا ہوں کہ میں خود بھی نونہال کا مطالعہ کرتا ہوں ۔

اسلام اور محمدؐ پر بہتانات از پروفیسر ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ (پی - ایچ - ڈی) جامعہ اسلام، مدینہ منورہ۔ ناشر: محمد زید ملک اے/۲۰۸، نیو مسلم ٹاؤن، لاہور، پاکستان - ۹۶ صفحات، دبیز آرٹ پیپر کا ٹائٹل - قیمت نامعلوم -

مستشرقین مسلمانوں کے خلاف حروبِ صلیبیہ کا ایک مستقل محاذ قائم کیے ہوئے ہیں - ان کی طرف سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر حملے بے محابا تو ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن ایک فن ان کا یہ ہے کہ مختلف تحریروں اور کتابوں میں وہ نگارشات کے پھول اور علمی حقائق کے جواہر بکھیر کر ان کی آڑ میں بارودی سرنگیں بچھا دیتے ہیں - ان سرنگوں کے پھٹنے پر بے شمار مسلمانوں کے ایمان اور ضمیر اور کردار مجروح ہو جاتے ہیں -

ملک صاحب، مؤلفِ کتابِ ہذا نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی ایک جلد میں سے ۴۲ ایسے مقامات نکالے ہیں، جہاں الزامات اور غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہے -

کام کا یہ نیا راستہ ہے اور اس پر چل کر ملک صاحب نے جو حقائق اور حوالے جمع کیے ہیں، وہ بصیرت افروز اور اذیت ناک ہیں - خدا ان کو جزا دے - مستشرقین کے بارے میں تو کسی عظیم الشان ادارے کو کام سنبھالنا چاہیئے -

---

اُردو ڈائجسٹ کا ضیاء الحق شہید نمبر بہ ادارت جناب الطاف حسن قریشی - دفتر: اُردو ڈائجسٹ - ۲۱، ایکڑ اسکیم، سمن آباد، لاہور ۲۵ - صفحات ۲۵۰ سے زاید - قیمت فی شمارہ ۱۵/- روپے -

ہمارے محترم دوست الطاف حسن قریشی نے پچھلے بیس پچیس سالوں میں پاکستان کے ہر شعبۂ زندگی کی اہم شخصیتوں کے انٹرویو حاصل کر کے ان کے ذہنوں اور کرداروں کی تصویریں ہمارے سامنے رکھیں - صدر ضیاء الحق شہید کے ۱۱ سالہ دور میں وہ ان سے ہر اہم مرحلے پر ملے اور تمام خاص مواقع پر انٹرویو حاصل کیے اور ذاتی رابطہ اتنا گہرا رہا کہ آج وہ ضیاء الحق شہید کی شخصیت اور کردار کے متعلق ایک گواہ کی حیثیت رکھتے ہیں - الطاف صاحب صداقت شعار دوست ہیں - انہوں نے ایک گفتگو میں فرمایا کہ میں نے ان کو ہر قسم کے حالات میں دیکھا اور ہر موضوع پر باتیں کیں، اعتراضات کیے، وضاحتیں

طلب کیں، مگر ہیں نے کسی لمحے یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ شخص اسلام کے نام کو مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔
الطاف صاحب نے خود جو کچھ دیکھا، سانحہ بہاول پور کا جو نقشہ سامنے آیا - جنازے کا جو منظر نگاہوں سے گذرا، ان پہلوؤں کو انہوں نے بڑے حسنِ بیان سے پیش کر دیا ہے - اپنے لیے ہوئے چار انٹرویو تو بھی پیش کر دیئے ہیں - شہید کے غیر ملکی دوروں کی روئیداد، ان کی تقاریر، شرقِ اوسط میں ان کے اثرات جیسے موضوعات کے علاوہ بہت سے بلند پایہ اہلِ قلم کے نثر پارے اور منظوم تاثرات نیز ڈائجسٹی ضرورت کے بعض ہلکے پھلکے مضامین بھی شامل ہیں -

اس نمبر کے لیے الطاف حسن قریشی اور ان کے پورے ادارے کو مبارک باد!

قومیت اور وطنیت | جناب پروفیسر محمد سلیم - ناشر: ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ، پاکستان ۸ - اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور -

قومیت اور وطنیت شیطان کے ایسے دو حربے ہیں کہ ان کے ذریعے وہ انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کو لقمۂ ظلم بنواتا ہے - سید صاحب نے اس مختصر پمفلٹ میں اس فتنے کے دورِ جدید میں ابھار کا تاثر کرہ حوالوں سے کیا ہے - قوم پرستی کے علیات مغرب میں کیا تھے، پھر مشرق میں ثمرات کیا نکلے، پھر ترکی قومیت اور عرب قومیت کے زہریلے شگوفوں کا ذکر، بھارت میں مسلم اقلیت کا حال، قومیت کے سینگوں پر مغربی استعمار کس طرح کھڑا ہوا، اور آخری بڑے حصۂ تحریر میں مثبت طور پر اسلام کا نقطۂ نظر واضح کیا ہے -

آخر میں ضمیمے بہت ہی مفید ہیں - پہلا ہے مختلف ملکوں میں پائی جانے والی زبانوں اور نسلوں کے متعلق، بہت جامع نقشہ ہے - دوسرا ہے ملکوں اور حکومتوں کی صورت گری میں مذہب کی کار فرمائی - بعد کے ضمیمے سندھ سے متعلق ہیں - مثلاً سندھ میں کون کب آیا؟ وہاں سے کون کب گیا؟ سندھ میں بولی جانے والی زبانیں، سندھی زبان سندھ سے باہر -

مختصر سے پمفلٹ میں اتنا کچھ! وہی روایت صادق آتی ہے کہ چاول کے دانے پر سورۂ لٰسین کی لکھائی -

---

وفیات

جانے والے جو واپس نہیں آئیں گے

حادثہ بہاولپور کے بعد مسلسل کئی غم انگیز واقعات رونما ہوئے۔

مولانا عبدالحق جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں اکوڑہ خٹک کے مقام پر دارالعلوم حقانیہ کی بنیاد ڈالی اور لاکھوں طلبہ دینی علم کے اس نورانی چشمے سے سیراب ہوئے۔ مورخہ ۷ ستمبر کو انتقال فرما گئے۔ انہی کی برکت سے رسالہ "الحق" کا اجرا ہوا، جس کے ایڈیٹر مرحوم کے صاحبزادے مولانا سمیع الحق ہیں۔ اس رسالے کا ایک خاص رنگ ہے اور رائج العام مدرسی اور مولویانہ سطح کے جرائد سے بالاتر ہو کر بہت مقبولیت حاصل کی اور اس کی تحریریں بہت مستند سمجھی جاتی ہیں۔ تہذیبِ جدید کے فتنوں اور ضلالت پسند گروہوں کی شرارتوں کو "الحق" دینی اور عقلی استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر دکھاتا ہے۔

مولانا ۱۹۸۵ء کے انتخاب میں کثیر التعداد ووٹوں سے سامنے قومی ایوان میں پہنچے اور وہاں آتے ہی پہلا مبارک کام یہ کیا کہ شریعت بل داخل کیا، جسے ایوانِ بالا نے فوراً منظور کر لیا۔ مگر ایوانِ زیریں نے اس کا راستہ روک دیا۔ اس کے لیے مولانا عبدالحق نے دینی متحدہ محاذ کے ساتھ مل کر عوام میں تحریک پیدا کرنے کی جدوجہد کی۔ مگر شریعت بل کو روکنے والی اسمبلی کی جڑ ہی صدر ضیاء کے حکم خاص سے یکایک کٹ گئی۔

مولانا غلبۂ دین کی اس تحریکِ عام کے لیے ایک سرمایۂ قوت تھے جو پاکستان میں اول روز سے چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی گراں قدر خدمات کو قبول فرما کر بخششوں سے نوازے اور ان کے اخلاف سینیٹر مولانا سمیع الحق، پروفیسر محمد الحق، حافظ انوار الحق اور مولانا اظہار الحق، نیز ان کے جمیع اہل خانہ اور اقربا و احبا کو توفیق صبر جمیل دے اور

ان کے غم و الم کے بدلے میں اُن پر خصوصی کرم بھی فرمائے - آمین -

---

اِدھر سابق چیف سیکرٹری مغربی پاکستان و ریٹائرڈ وفاقی ڈپٹی سیکرٹری ڈیفنس شیخ اکرام الحق ۷۲ سال کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہوجانے سے وفات پاکر ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کو میانی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیئے گئے ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ -

مرحوم نے متعدد بڑے عہدوں پر رہ کر مختلف دائروں میں خدمات انجام دیں سیکرٹری دفاع بھی رہے - پاکستان سے بھی سچی محبت رکھتے تھے - وہ "بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند" سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دیانت کیش اور خوش اخلاق تھے، شخصی طور پر جماعتِ اسلامی سے محبت رکھتے تھے - خدا ان پر رحمتیں نازل فرمائے -

ہم ان کے صاحبزادوں انیس الحق اور ڈاکٹر ندیم الحق اور مرحوم کی بیوہ اور صاحبزادیوں اور ان کے بھائیوں اور جملہ اہلِ خاندان و جمیع حلقۂ رفاقت کے سامنے اپنے صدمے کا اظہار کرتے ہیں اور سب کے لیے دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق دے، نیکی اور خیرات کی توفیق دے اور اس صدمہ کی تلافی کے لیے سب پر خاص نوازشات فرمائے -

---

مولانا عبدالحی رکن مجلسِ شوریٰ جماعتِ اسلامی پاکستان و امیر جماعتِ اسلامی بن قاسم جو مولانا نثار اللہ ڈائریکٹر اسلامک سنٹر لندن کے بھائی تھے، انہی دنوں اجلاسِ شوریٰ سے فارغ ہو کر واپس گئے تھے اور بظاہر ٹھیک ٹھاک تھے، مگر ۲۲ ستمبر کو اچانک دل کا دورا پڑا ، جو جان لیوا ثابت ہوا - اللہ تعالیٰ مرحوم پر صدہا رحمتیں اور مغفرتیں نازل فرمائے اور ان کے اہلِ خانہ اور خاندان کے علاوہ ان سے محبت کرنے والے تحریکی رفقا کو بھی صبر اور سکینت اور عزیمت عطا کرے -

---

چوہدری بشیر احمد صاحب منیجر ترجمان القرآن سے ہمیں دلی ہمدردی ہے کہ ان کی اہلیہ اِن دنوں جدا ہو کر عالمِ بقا میں پہنچیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو خاص مغفرت اور نوازشات سے بہرہ مند کرے، اور چوہدری صاحب کو جو راقم کے لیے بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں، صبر اور اس کا اجر عنایت کرے۔ چوہدری صاحب کے لیے عمر اور صحت دونوں لحاظ سے یہ صدمہ خاصا بھاری ہے۔ خدا مدد کرے۔ ان کے دونوں بچوں کے لیے بھی خدا سے دُعا ہے کہ وہ ان پہ سایۂ رحمت رکھے۔

اِدھر تازہ خبرِ غم مشہور شاعر، صحافی رئیس امروہوی کی مظلومانہ وفات کی ہے جن پر نامعلوم افراد نے ان کی اپنی رہائش گاہ پر فائر کر کے ان کو خون میں لت پت چھوڑا۔ ۷۴ سالہ مصنف و صحافی جانبر نہ ہو سکا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے، اخبارات میں کام کرتے تھے، ادبی حلقوں اور تنظیموں میں اہم مقام حاصل تھا۔ مرحوم کی اولاد ۵ بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس مظلومانہ موت کے شکار ہونے والے پر بھی اور اس کے اہلِ خانہ پر بھی رحم فرمائے۔

۲۲ ستمبر ہی کو ہمارے دوست افضل جاوید صاحب، جو جماعتِ اسلامی کے مرکزی شعبۂ نشر و اشاعت میں کام کرتے ہیں، اُن کے والد رحیم یار خاں میں انتقال کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ!

چند دن پہلے کراچی میں ایک اور اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوان طالب علم عامر اپنے شہید رفقا کی صف میں جا ملے۔ ان پر رحمتوں اور انوار کا نزول ہو، ان کے گھر والوں پر اور ان کے رفیقوں پر بھی خدا تعالیٰ صبر و سکینت نازل کرے۔

"ہم سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں، اور ہم سب کو اُسی
کی بارگاہ میں لوٹ کر حاضر ہونا ہے۔"

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اس میں

مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کردیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اُٹھاسکیں۔

قسم اوّل : ۱۵۰/- روپے

قسم دوم : ۱۲۵/- روپے

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ اُردو بازار لاہور

فون نمبر ۳۲۴۴۶۸